ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۴۰

چوتھا سال: چوتھی کتاب

اپریل ۲۰۰۶ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان

ای میل: angarey_90@hotmail.com

ویب سائٹ: www.apwn.net/urdu

فون: ۰۶۱-۵۲۳۴۸۶ ، ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶

کمپوزنگ: اظہر خان، یونی کارن کمپوزرز، چونگی نمبر ۶، ملتان

قیمت: تیس روپے

زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

انٹرویو:

۱۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی سے ایک غیر رسمی ملاقات — (انٹرویو پینل) — ۵

مضامین:

۲۔ عالمگیریت اور ادب — ڈاکٹر روبینہ شاہجہاں — ۲۴

۳۔ مارک ٹوئین کی کہانی 'دعائے جنگ'۔ ایک مطالعہ — ایم۔ خالد فیاض — ۳۱

۴۔ تین دوست تین کتابیں — ڈاکٹر محمد امین — ۳۸

کہانیاں:

۵۔ خزاں رسیدہ پھول — اخلاق انصاری/ننگر چنا — ۴۲

۶۔ سیاہ کار — ڈاکٹر عباس برمانی — ۴۸

۷۔ نیون سائنز — لیاقت علی — ۵۲

۸۔ سفید جسم — عطاالرحمٰن تمثیل — ۵۹

انشائیہ:

۹۔ قصہ دوسرے آخری درویش کا — ابرار آبی — ۷۰

غزلیں:

۱۰۔ ظفر اقبال (۱۲ غزلیں) قاضی حبیب الرحمٰن (۲ غزلیں)، غلام حسین ساجد (۲ غزلیں)، عطاالرحمٰن قاضی (۱ غزل) حفیظ شاہد (۶ غزلیں)، خاور اعجاز (۵ غزلیں)، صابر عظیم آبادی (۲ غزلیں)، حصیر نوری (۲ غزلیں)، مشتاق شبنم (۲ غزلیں)، اکرم عتیق (۲ غزلیں)، اوصاف نقوی (۴ غزلیں) پرویز ساحر (۲ غزلیں)، نبیل احمد نبیل (۴ غزلیں) — ۷۳

حروفِ زر (قارئین کے خطوط):

۱۱۔ بنام مرتب — ۱۱۸

سید عامر سہیل

چند باتیں

شعر وادب، موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کا اعلیٰ ذوق ہماری حسِ جمال ہی کو تقویت نہیں بخشتا ہے بلکہ ایک بہتر انسان اور صحت مند معاشرے کی تشکیل، تفہیم اور اُن کے باہمی رشتوں کو سمجھنے میں مددگار بھی ثابت ہوتا ہے۔ میکانکی زندگی کی جکڑ بندیوں سے، جزوقتی ہی سہی، انسان کی آزادی اور زندگی سے لطف کشید کرنے کا سلیقہ اور ہنر اِنہی رویوں کے ذریعے حاصل ہونا ممکن ہے۔ فنونِ لطیف مسرت باہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ زندگی کی اعلیٰ اقدار کی تخلیق میں بھی ایک فرد اور سماج کے لیے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مگر سوال یہاں مسرت کے پیمانوں، میعارات اور اِس کے شعور کا ہے جس کو سمجھنے اور پہچاننے سے آج ہم اور خصوصاً ہماری نوجوان نسل کافی حد تک عاری ہو چکی ہے۔ فنونِ لطیفہ کے حوالے سے ہمارا عمومی رویہ شدید ترین عدم دلچسپی کا ہوتا جا رہا ہے، خاص طور پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں، بالخصوص طالب علم اور نوجوانوں کا یہ رویہ، یقیناً خطرے کا اعلامیہ بنتا جا رہا ہے۔ ذوقِ جمال اور احساس حسن کے معیارات روز بروز جس طرح پست ہوتے جا رہے ہیں نیز ہماری دلچسپی اور پسندیدگی کے پیمانے اِس تیزی سے مصنوعی اور سطحی صورتِ حال اختیار کرتے جا رہے ہیں وہ ہماری ذہنی، فکری اور سماجی زوال کی نشان دہی کرتے ہیں۔

دیکھا یہی گیا ہے کہ آج کی نسل مغائرت اور بے گانگی کا شکار ہے، ایک طرح کی شدید اُکتاہٹ، بیزاری، جھنجلاہٹ اور غصہ اُن کے ذہنوں کے اعصاب پر طاری ہے۔ شعر وادب کی تقریب ہو یا موسیقی کی محفل ہر حوالے سے ہماری پسندیدگی کے معیارات تبدیل ہو چکے ہیں۔ اَب ادبِ عالیہ بیکار کا مشغلہ اور فضول سی کارکردگی اور عمدہ موسیقی بے وقت کی راگنی قرار پائی ہے۔ اِس کے مقابلے میں جس مزاج کا اَدب پڑھا اور موسیقی سنی جا رہی ہے وہ سطحی جذبات اور کچی رومانویت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ صورتِ حال کسی حد تک تو قابلِ برداشت ہے مگر اعلیٰ تعلیمی سطح پر زبانوں وادب کے طالب علموں میں ذوق وشوق کی کمی، اُکتاہٹ اور عدم دلچسپی نا قابلِ یقین ہے۔ محض ڈگریوں کا حصول ہمارے طالب علم کا مطمع نظر ہے۔ اَدب کا مزاج، روح اور ذوق کا حصول شاید اَب ثانوی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ تحقیقی اور تنقیدی مقالات میں بھی کچھ اِسی انداز کی بے برکتی پائی جاتی ہے، وجہ اِس کی یہی ہے کہ ہمارے طالب علم سنجیدہ ادب کو محض نصابی ضرورت کے تحت ہی پڑھتے ہیں اور نصاب ہمارے طالب علموں کے اندر یقیناً ذوق وشوق پیدا کرنے سے تا حال عاری ہے۔ اِس ساری صورتِ حال کا ذمہ داری کسے ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ ہمارے ادارے، میڈیا، فرسودہ سسٹم یا پھر خود اُستاد کی ذات۔ اِن میں سے بہر حال کسی نہ کسی کو (کسی نہ کسی حد تک) اِس ذمہ داری کو اُٹھانا ہی پڑے گا۔

اگر ہم غور کریں تو اِس صورتِ حال کے پسِ منظر کے اسباب و وجوہات کا پورا دفتر دکھائی دے گا اور ہر ادارہ اور ہر مقتدر کردار اِس کے ذمہ دار نظر آئیں گے۔ مگر میرے خیال میں اِس کی پہلی اور بنیادی وجہ معاشرے کا غیر سیاسی ہونا اور لوگوں کا احساسِ شراکت سے محروم ہونا ہے۔ گذشتہ پچیس تیس برسوں سے غیر جمہوری رویوں نے اپنی بقاء کے لیے اِس معاشرے کو جس طرح غیر سیاسی اور غیر نظریاتی بنانے کی کوشش کی ہے اِس نے لوگوں کو اپنی کمٹمنٹ سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ کسی بھی معاشرے کا فکری اعتبار سے جو بہاؤ ہونا چاہیے اور جس طرح اِسے فطری طور پر نشوونما پانی چاہیے ایسی فضا اور ماحول ہمارے ہاں نہیں بن سکی۔ طلباء تنظیمیں، مزدور یونینیں اور سیاسی جماعتیں جو معاشرے کو فکری اور ذہنی طور پر فعال رکھتی ہیں، اُنہیں بھرپور کوشش سے مجہول اور بے بس بنایا گیا اور اُن کے عمل کو معکوس کرنے کی کوشش کی گئی۔ معاشرے میں اِس بڑے خلاء کو غیر جمہوری قوتوں، غیر سیاسی طاقتوں اور نظریات سے عاری لوگوں نے پُر کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فرد کا اعتبار دوسرے پر اور اداروں پر اُٹھ گیا اور احساسِ شراکت رفتہ رفتہ کمزور پڑ کر ختم ہو گیا۔ معاشرے کا فطری بہاؤ اور ارتقاء نہ ہونے کے سبب فرد، مغائرت، بے گانگی، اُکتاہٹ، عدم تحفظ، بے سمتی اور غیر یقینی صورتِ حال کا شکار ہو گیا۔ یہ حالات صرف معاشرے کے فرد پر ہی نہیں گزرے بلکہ ادارے بھی اِس کا شکار ہوئے۔ آج کی نسل اِس المیے سے دوچار ہے اور عدم دلچسپی کے پُل صراط سے گزر رہی ہے۔ دوشی کون ہے؟ اِس کا جواب میرا خیال ہے میرے آپ سمیت سبھی جانتے ہیں۔۔۔۔

☆☆☆

اردو کے عہد ساز شاعر کے حوالے سے ''انگارے'' کا

ظفر اقبال نمبر

شائع کیا جا رہا ہے

آپ سے گزارش ہے کہ ظفر اقبال اور ان کی شاعری کے حوالے سے اپنی شخصی، تنقیدی اور تحقیقی تحریریں جلد از جلد ارسال فرما دیں۔

تحریر و ترتیب: سجاد نعیم
تکنیکی معاونت: منور مغل

ڈاکٹر احمد حسن دانی سے ایک غیر رسمی ملاقات

(انٹرویو پینل: سید عامر سہیل، ساجد اعوان، جاوید سلیانہ، ریحان اقبال)

ڈاکٹر احمد حسن دانی کی شخصیت نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے۔ علمی اور تحقیقی میدان میں اِن کا شمار دنیا کے چند اہم ماہرین آثاریات میں ہوتا ہے۔ آج ہماری خوش نصیبی ہے کہ وہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی میں حاصل کی۔ انہوں نے بنارس یونیورسٹی انڈیا سے ایم۔اے آرکیالوجی کیا اور اُسی یونیورسٹی سے بطور اُستاد اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ۱۹۷۳ء میں آپ قائداعظم یونیورسٹی تشریف لائے اور پہلی مرتبہ وہاں سوشل سائنسز کے دس شعبہ جات قائم کیے اور آپ تین مرتبہ اِن کے ڈین بھی رہے۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی ایک سو دس کتابوں کے مصنف ہیں اور تقریباً ایک ہزار سے زائد تحقیقی مقالہ جات تحریر کر چکے ہیں۔

سوال:

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

عمر رفتہ کو آواز دینا کیسا لگتا ہے؟

جواب: بہت اچھا لگتا ہے، ہم نے کشمیر سے مائیگریٹ کر کے امرتسر آئے۔ امرتسر میں آدھی سے زیادہ پاپولیشن کشمیری مسلمانوں کی تھی۔ ابتدائی تعلیم امرتسر پنجاب سے حاصل کی۔ وہاں پر اُردو اور فارسی چلتی ہے، ہندی نہیں تھی۔ والد صاحب کا بزنس کلکتہ اور ناگ پور میں تھا اُنہوں نے مجھے کہا، امرتسر چھوڑ کر ناگ پور آ جاؤ۔ میں وہاں چلا گیا۔ یہاں تو اُردو نہیں بولی جاتی تھی۔ ہندی یا، میرا تھی، وہاں پر یہ زبانیں بھی سیکھ لیں۔ اِن زبانوں میں ہم وہاں پڑھتے رہے۔ اُس زمانے میں ریڈیو نیا شروع ہوا تھا۔ ریڈیو پر اُردو بولنے والے بہت کم لوگ آتے تھے۔ مجھے اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کو ریڈیو پر بلوایا گیا اور کہا گیا کہ آپ اُردو میں تقریر کریں کیونکہ اُس زمانے میں ہندو لوگ ہندی سمجھتے تھے اور زیادہ بولی جاتی تھی۔ اُن دِنوں میرے پاس ریڈیو بھی نہیں تھا کیونکہ پیسے نہیں تھے۔ میری بیگم نے کہا آپ ایک کام کریں آپ ریڈیو پر Talk دیں جب پیسے پورے ہو جائیں گے تو ریڈیو خرید لیں گے۔ اِس طرح ہم نے پیسے جمع کیے اور ریڈیو خریدا۔ اُن دِنوں پر ڈیوسروں کی تنخواہ

بہت کم ہوا کرتی تھی۔ پانچ سو یا چھ سو روپے تو اُس میں سے پیسے بچانا اور ریڈیو خریدنا مشکل تھا۔

سوال: آپ کی تاریخِ پیدائش کیا ہے؟

جواب: ۲۰ جون ۱۹۲۰ء کو ہندوستان میں پیدا ہوا اور پھر وہیں پڑھا لکھا۔

سوال: آپ کشمیر میں پیدا ہوئے اُس دور کے کشمیر کو آپ کس طرح Percieve کرتے ہیں؟ اور آج کس طرح سوچتے ہیں؟

جواب: چونکہ ہماری فیملی کشمیری فیملی تھی۔ سری نگر کے پاس ایک گاؤں آرنگ تھا۔ وہاں کے ہم رہنے والے تھے۔ ہمارے دادا پردادا بزنس کرتے تھے۔ اُن کا زیادہ تر بزنس امرتسر میں ہوتا تھا۔ امرتسر میں آدھی پاپولیشن کشمیری مسلمانوں کی تھی۔ وہاں سے وہ بزنس کرتے کرتے انگریزوں کے ساتھ کلکتہ آ گئے۔ کلکتہ سے ایک ہمارے پردادا کا نوکر تھا جس کا نام عبداللہ تھا وہ پیسے لے کر بھاگ گیا۔ اس کے پیچھے ہمارے پردادا بھی کلکتہ سے نکلے اور اُس کی تلاش میں وہ بمبئی پہنچ گئے۔ اُس وقت صرف موٹر کا راستہ ہوتا تھا۔ ریل اُس زمانے میں نہیں تھی۔ میرے پردادا وہاں سے چھتیس گڑھ پہنچے جس کا کیپیٹل رائے پور تھا۔ رائے پور میں شام ہوگئی وہ وہیں ٹھہر گئے وہاں ایک رانی نے پردادا کو دیکھا اور کہا یہ کیسا انسان ہے جو بہت خوبصورت دیکھائی دیتا ہے کیونکہ رائے پور میں سارے لوگ کالے ہوتے ہیں۔ ہمارے پردادا چھ فٹ دو انچ لمبے تھے گورے چٹے تھے اور آنکھیں اُن کی بلیو تھیں۔ وہ رانی پیار سے میرے دادا سے کہنے لگیں میرے ساتھ شادی کر لو۔ ہمارے پردادا نے کہا کہ میں مسلمان ہوں ہندو سے کیسے شادی کر سکتا ہوں۔ شادی تو نہیں ہو سکی مگر اُس رانی نے پردادا کو چھ مہینے تک نہیں چھوڑا اور اُس رانی نے آدھی زمینداری ہمارے پردادا کو دے دی اور وہ زمینداری ہندوستان میں ابھی تک ہماری فیملی میں ہے۔ میں تو ہندوستان چھوڑ کر پاکستان آ گیا تھا جبکہ میرا بڑا بھائی پاکستان نہیں آیا تھا۔ اُن کا خیال تھا خاص طور پر میرے والد کا کہ کشمیر پاکستان میں آ جائے گا اور ہم سب سارے کے سارے واپس اپنے گھر کو چلے جائیں گے۔ وہ کشمیر پاکستان کے حصے میں آیا ہی نہیں اور ہم وہیں رہ گئے۔

سوال: آپ نے اپنی تعلیم کہاں کہاں سے حاصل کی؟

جواب: میں نے ہندی پڑھی، میرا ٹھی پڑھی اور اُس کے بعد سنسکرت پڑھی۔ ناگ پور میں واحد مسلمان تھا جو وہاں سنسکرت پڑھتا تھا جب میں نے بی۔اے پاس کیا تو میرے ٹیچر نے کہا اگر تم نے سنسکرت پڑھ لی ہے تو تمہیں ہندوؤں کے متعلق بھی جاننا چاہیے۔ اِس لیے تم بنارس چلے جاؤ۔ اُس ٹیچر کے کہنے پر میں ہندو یونیورسٹی بنارس چلا گیا۔ اُس زمانے میں وہاں پر رادھا کرشنا وائس چانسلر تھے۔ اُنہوں نے کہا ہم تو یہاں کسی مسلمان کو داخل ہی نہیں کرتے۔ میں نے پوچھا کیوں جی آپ مسلمانوں کو یہاں پر داخلہ کیوں نہیں دیتے۔ کہنے لگے یہاں پر داخلہ لینے کے لیے

سنسکرت جاننا ضروری ہے۔ میں نے کہا میں سنسکرت پڑھا ہوا ہوں۔ اُنہوں نے کہا اچھا تم سنسکرت پڑھے ہوئے ہو۔ اچھا مجھے کچھ سناؤ۔ ہم نے کالی داس کا شلوک سنانا شروع کیا تو پھر اُنہوں نے کہا ٹھیک اَب تمہارا داخلہ ہو جائے گا۔ میں پہلا مسلمان تھا جس کو ہندو یونیورسٹی بنارس میں داخل کیا گیا اُس کے بعد جب میں نے ایم۔اے کا امتحان دیا تو میں ایم۔اے کے امتحان میں فرسٹ کلاس فرسٹ آ گیا۔ میرا Examiner کلکتہ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا ایک پرچہ اُن کے پاس گیا۔ اِس پرچہ میں اُنہوں نے ۱۰۰ میں سے ۹۹ نمبر دیے پھر بعد میں جب اُن سے ملاقات ہوئی تو میں کہا آپ نے مجھے ۹۹ نمبر دیئے تھے ایک نمبر کیوں کاٹ لیا۔ اُنہوں نے کہا نمبر تو میں اور بھی کاٹنا چاہتا تھا مگر جگہ ہی نہیں ملتی تھی۔ آپ کا ایک نمبر ہینڈ رائیٹنگ کا کاٹ لیا۔

سوال: ابھی ہم ۱۹۴۷ء پر نہیں آئے ابھی ہم ماضی کی طرف جائیں گے۔ جیسا کہ آپ نے کہا کہ آپ نے ابتدائی تعلیم ہندوستان میں حاصل کی اُس دور میں آپ کے کوئی دوست بھی رہے ہوں گے جو اَب تک آپ کو یاد آتے ہوں؟

جواب: ہندو دوست زیادہ تھے چونکہ وہ ہندو تھے پاکستان تو آیا کوئی نہیں مسلمان ایک آیا تھا اُس کا نام ڈاکٹر ظفر ہے۔ وہ یہیں اسلام آباد میں ہوتے ہیں۔ پہلے وہ پاکستان گورنمنٹ میں سروس کرتے تھے اَب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ وہ میرے ساتھ مڈل سکول میں پڑھتے تھے میرے ساتھ اُنہوں نے میٹرک پاس کیا۔ اُس کے بعد میں نے آرٹس کے مضامین لیے اور اُس نے سائنس کے مضامین کا انتخاب کیا۔ اُس زمانے میں دو ہی مضامین رکھنے کی اجازت تھی سائنس یا آرٹس۔ Math ایک ایسا Subject تھا جو سائنس اور آرٹس دونوں میں پڑھایا جاتا تھا۔ ہمارے گھرانے کا Math بہت اچھا تھا۔ میں نے ناگ پور یونیورسٹی سے بی۔اے کیا اور اُس کے بعد ہندو یونیورسٹی بنارس چلا آیا۔

سوال: کیا اُس دور کا بنارس یاد آتا ہے؟ غالب نے تو بنارس کی بہت تعریف کی ہے۔

جواب: بہت یاد آتا ہے۔ میں ۱۹۴۲ء-۴۳ء میں بنارس میں تھا۔ وہاں پر مسلمان طالب علموں کو ہوسٹل میں نہیں رکھتے تھے اور کھانے کے لیے Mess پر بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے کہا کہ میں کیا کروں میں یہاں کیسے رہوں گا؟ ہوسٹل کے وارڈن نے کہا کہ تم اپنی تھالی لے کر آجایا کرو اور دروازے کے باہر کھڑے ہو جانا ہم اُس میں کھانا ڈال دیا کریں گے اور پھر وہ کھانا اپنے کمرے میں لے جا کر کھا لینا۔ اِس طرح میں کھانا کھاتا اور اپنے برتن بھی خود ہی دھوتا۔ لیکن خوش قسمتی سے جب ایم۔اے کا امتحان ہوا اور میں فرسٹ کلاس فرسٹ آ گیا Naturaly اُن دِنوں رزلٹ اخبار میں آتا تھا اور ساتھ نام بھی ہوتے تھے تو یو۔پی والے کہنے لگے یہ کون مسلمان ہے جو ہندو یونیورسٹی بنارس سے فرسٹ آ گیا۔ کیونکہ ہم کشمیر کے رہنے والے تھے اور ہمیں کوئی

وہاں پر جانتا بھی نہیں تھا۔ خیر اِس کی وجہ سے یہ ہوا کہ وائس چانسلر انورادھا کرشنا نے کہا جی آپ تو ہمارے اُستاد ہو گئے (کیونکہ Rules کے مطابق فرسٹ آنے والا طالب علم یونیورسٹی کا اُستاد ہو جاتا تھا) لیکن چونکہ آپ مسلمان ہیں اِس لیے آپ کو یہاں پڑھانے نہیں دیں گے۔ ہم مسلمان کو یہاں ٹیچر نہیں رکھتے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے۔ اَب پتہ نہیں وہاں کی کیا پوزیشن ہے؟ انورادھا کرشنا نے کہا کیونکہ آپ ہمارے ٹیچر ہو گئے ہیں ہم آپ کو تنخواہ تو دیں گے لیکن پڑھانے نہیں دیں گے۔

سوال: آپ آرکیالوجی کی طرف کیسے آئے؟ کوئی ایسا نام، دوست یا اساتذہ جنہوں نے آپ کو بہت زیادہ Impress کیا؟

جواب: اُس زمانے میں برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کی حکومت تھی اُنہوں نے سر مارٹی مروھیلر کو انگلینڈ سے بلوایا وہ Well Known آرکیالوجسٹ تھے۔ انہوں نے ہندوستان سے نئے لوگوں کا انتخاب کیا۔ انہوں نے ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کا وزٹ کیا اور وہاں سے کچھ لوگوں کا Select کیا اور اُن میں میری بھی Selection ہو گئی اُس نے ایک ٹریننگ سکول دہلی میں کھولا اور وہاں اُنہوں نے ٹریننگ دی۔ مارٹی مروھیلر نے کہا یار میں تمہیں نوکری تو دے دوں مگر تم تو ہندو یونیورسٹی کے سٹوڈنٹ ہو۔ ہم تم کو نوکری نہیں دے سکتے۔ میں نے کہا سر میں ہندو نہیں ہوں میں مسلمان ہوں اُس نے کہا اچھا تم مسلمان ہو میں تو سمجھا تھا کہ تم ہندو ہو۔ ایک میرا نام دانی ایسا تھا جو مسلمانوں کا لگتا ہی تھا پھر اُس نے کہا اچھا ہم آپ کو نوکری دے دیں گے۔ اِس طرح مجھے برٹش گورنمنٹ آف انڈیا میں نوکری ملی اور میری پوسٹنگ دہلی میں ہوئی۔

سوال: ڈاکٹر صاحب آپ کے والد محترم کا نام کیا تھا؟

جواب: میرے والد کا نام غلام نبی دانی تھا۔ دانی کا ٹائیٹل انگریزوں نے دیا۔ یہ ہمارا Sir Name ہے۔ ہماری ذات وائیں ہیں۔ ابھی بھی ہم شادی بیاہ میں وائیں لکھتے ہیں چونکہ برٹش گورنمنٹ نے ہمیں دانی کا خطاب دے دیا تھا اِس لیے زیادہ تر لوگ دانی ہی کی وجہ سے جانتے ہیں۔

سوال: آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟ اور آپ کی شادی کہاں ہوئی؟

جواب: میرے تین بھائی تھے اور دس بہنیں تھیں چونکہ ہم سی۔پی میں رہتے تھے لیکن پتہ نہیں آپ لوگوں کو معلوم ہو کہ نہ ہو کہ ہم کشمیری لوگ کشمیر سے باہر شادی نہیں کرتے۔ شادی کے لیے یا تو ہم کشمیر جائیں گے یا پھر امرتسر شہر جہاں کی آدھی سے زیادہ پاپولیشن کشمیری مسلمانوں کی ہے۔ میری شادی ہمارے چچا کی لڑکی سے ہوئی۔

سوال: آپ نے اپنا گولڈن پیریڈ ہندوستان میں گزارا اور پھر پاکستان آئے۔ پاکستان آنے سے پہلے کوئی ایسی محبتیں جو اَب بھی آپ کو یاد ہوں؟

جواب: بہت یاد ہیں۔ میری پوسٹنگ جب دلی میں ہوئی تو اُس وقت ہمارے ایک انجینئر تھے جن کا

نام ڈاکٹر انصاری تھا وہ سہارنپور کے رہنے والے تھے اُن کی بیوی جرمن تھی اُن کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ ڈاکٹر انصاری نے ایک دن مجھے گھر پر چائے پہ بلایا۔ اُس زمانے میں دہلی میں مکان نہیں ملتا تھا اور وہ تمبو میں رہتے تھے۔ میں اُن کے گھر چائے پینے کے لیے گیا ہم باہر بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں اُن کی بیوی آ گئی کرسیاں دو ہی تھیں جن پر ہم بیٹھے ہوئے تھے میں اُٹھا اور تیسری کرسی لانے کے لیے اُن کے تمبو کی طرف گیا جیسے میں نے تمبو کا پردا اُٹھایا تو سامنے ایک لڑکی نظر آئی اُس نے مجھے حیرت سے دیکھا کہ یہ کون آدمی ہے جو اندر آ رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکی بھی باہر آ گئی۔ ڈاکٹر انصاری نے بتایا کہ یہ میری بیٹی ہے۔ میں نے کہا بڑی اچھی بات ہے تو پھر جب ہم دونوں کی ہنسی خوشی ہوئی اور پھر محبت ہوگئی۔ لیکن محبت کو ہم ظاہر کر ہی نہیں سکتے تھے (قہقہہ مارتے ہوئے)۔ لڑکی کا باپ چاہتا تھا کہ میری شادی اُس کی بیٹی سے ہو جائے کہ لیکن لڑکی کی ماں جو کہ جرمن تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایسا ہو۔ تقسیم سے پہلے ہماری میل جول تو ہوتی رہی لیکن شادی نہ ہو سکی۔ تقسیم کے بعد اُنہوں نے بھی پاکستان .Opt کیا اور اُن کی پوسٹنگ کراچی میں ہوگئی جبکہ میری پوسٹنگ ڈھاکہ میں ہوگئی۔ میں اُدھر چلا گیا اور وہ اِدھر آ گئے۔ ملنا جلنا چھوٹ گیا لیکن اُنہوں نے کوشش کی کہ یہ آدمی کدھر ہے۔ آخر ایک دفعہ کراچی میں اُن سے ملاقات ہوئی پھر مجھے شادی کی آفر ہوئی میں نے کہا دیکھو ہم کشمیری مسلمان ہیں اور ہم کشمیری مسلمان کشمیری مسلمانوں ہی میں شادی کرتے ہیں باہر نہیں کر سکتے اگر میں شادی کر لوں تو میرا باپ مجھے مار ڈالے گا۔ اِس طرح اُن کی بیٹی سے شادی نہ ہو سکی۔

سوال: سر کیا یاد میں وہ محبت اَب بھی تازہ ہے؟

جواب: یاد میں تو ابھی بھی تازہ ہے کیونکہ ہم دونوں کی قریب قریب ایک ہی عمر تھی۔

سوال: جیسا کہ آپ نے بتایا کہ آپ کی شادی آپ کی فیملی میں ہوئی ہے کیا آپ کی بیوی پڑھی ہوئی تھیں؟

جواب: جی نہیں! آپ کو معلوم ہوگا کہ اُس زمانے میں مسلمان اپنی لڑکیوں کو سکول/کالج نہیں بھیجتے تھے صرف گھر میں پڑھاتے تھے۔ اِس طرح میری بیوی بھی کبھی سکول نہیں گئی لیکن گھر میں وہ اپنے بھائیوں سے تھوڑا بہت ہندی، اُردو اور کچھ انگریزی پڑھنا لکھنا سیکھ گئی تو اِس طرح ہماری بیوی کی کوئی باقاعدہ ایجوکیشن نہ تھی۔ شادی کے بعد جب ہم لندن گئے تو میں نے کہا کہ بھئی اَب تم نائٹ کلاسز جوائن کر لو تو وہاں اُنہوں نے نائٹ کلاسز جوائن کیں اور انگریزی کو باقاعدہ سیکھا۔

سوال: آپ دنیا کی بائیس زبانیں جانتے ہیں کیا آپ نے یہ زبانیں باقاعدہ سیکھیں؟ یا جہاں جاتے رہے وہاں سیکھتے رہے؟

جواب: باقاعدہ زبان تو ہم نے ہندی، سنسکرت سیکھی۔ گھر میں Naturly اُردو سیکھی اور والدہ نے ہمیں فارسی پڑھائی۔ یہ زبانیں تو ہم نے سیکھیں۔ لیکن چونکہ ہمیں مختلف جگہوں پر رہنے کا اتفاق ہوا

جیسے ناگ پور میں مَیں نے نہ صرف میراٹھی زبان سیکھی بلکہ میراٹھی لڑکیوں سے دوستی بھی ہوگئی۔

سوال: ایک دفعہ اَب ہم پھر ماضی میں جاتے ہیں۔ آپ اُس وقت کے چند پڑھے لکھے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے تھے کیا کبھی جناح صاحب سے بھی ملاقات ہوئی؟

جواب: جن دِنوں ہم دہلی میں رہتے تھے تو اُن دِنوں جناح صاحب بھی دہلی میں رہتے تھے اور ہم ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ جناح صاحب کا گھر میرے گھر کے ساتھ ہی تھا۔ قریب قریب روز ہی صبح دُعا سلام ہو جاتی تھی لیکن چونکہ میں سیاست دان نہیں تھا وہ سیاست دان تھے اور میں گورنمنٹ سرونٹ تھا سلام دُعا کے علاوہ کبھی سیاست پر بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

سوال: آپ کی زندگی جتنی لبرل اور خوبصورت ہمیں دکھائی دیتی ہے اور یقیناً ہوگی بھی۔ جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا اور سارے واقعات آپ کے سامنے ہوئے اِس پورے پس منظر کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

جواب: ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے سے پہلے ۳ جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے Declare کیا کہ پاکستان بنے گا تو اُس وقت میری پوسٹنگ آگرہ میں تھی۔ ہم وہاں پر دو آفیسر تھے ایک ہندو تھا جس کا نام مادھوسرودستھ تھا اور وہ لاہور کا رہنے والا تھا اور میں اُس کا اسسٹنٹ تھا کیونکہ اُس زمانے میں ہمارے گھر ریڈیو تو تھا نہیں تو میں اُس کے گھر چلا گیا تا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کو سنا جائے جب تقریر ختم ہوئی تو مادھوسرودستھ نے کہا اَب تم کیا کرو گے۔ میں نے کہا اَب کوئی چارہ ہی نہیں سوائے پاکستان جانے کے۔ اچھا اَب آپ پاکستان جائیں گے آپ کو وہ لوگ Accept کر لیں گے کیونکہ آپ تو سنسکرت بھی جانتے ہیں اور ہندی بھی۔ میں نے کہا سر میں ہندی اور سنسکرت بھی جانتا ہوں اِس کے علاوہ فارسی اور اُردو بھی مجھے ماں نے سکھائی ہوئی ہے۔ اُس زمانے میں ہمارا خیال تھا کہ کشمیر پاکستان آ جائے گا۔ میرے والد صاحب نے مجھے ٹیلی فون کیا اور میرے بڑے بھائی کو میرے پاس بھیجا کہ تم پاکستان .Opt کرو، کشمیر تو پاکستان میں آ جائے گا تو پھر ہم سب لوگ کشمیر چلے جائیں گے۔ لیکن کشمیر پاکستان میں آیا ہی نہیں۔

سوال: ۱۹۴۷ء میں بڑے دردناک واقعات ہوئے، قتل و غارت ہوئی۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اُس دور میں جو پورا منظر نامہ بنا سیاسی انداز یا تاریخی حوالے سے آپ کس طرح Percieve کرتے ہیں؟

جواب: میں نے اِن تمام واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کیونکہ میں اُس زمانے میں دہلی میں تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ پاکستان کا اِس سے بڑا حصہ یہاں آ جائے گا۔ لیکن انگریزوں نے خاص طور پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی وجہ سے علی گڑھ بھی چلا گیا، اجمیر بھی چلا گیا، بھوپال بھی چلا گیا اور پاکستان کے دو حصے رہ گئے۔ ایسٹ پاکستان اور ویسٹ پاکستان۔ اُس زمانے کے مسلمانوں کا یہ خیال نہیں تھا کہ اتنا چھوٹا سا حصہ پاکستان رہ جائے گا۔ کم از کم کچھ حصہ دہلی، آگرہ، علی گڑھ پاکستان میں آنا

چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ ہمارا خیال تھا پورا پنجاب پاکستان آجائے گا دہلی تک آجائے گا۔ دہلی شہر تو اُس وقت سارے کا سارا مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا یہی خیال تھا کہ پاکستان کا حصہ بن جائے گا مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔

سوال: اُس دور میں Main Stream میں جو سیاست دان تھے جن میں جناح صاحب، نہرو (اشتیاق حسین قریشی بھی تھے- ڈاکٹر دانی) اِس حوالے سے آپ کی کوئی یاد ہو جو ہم سے Share کرنا چاہیں؟

جواب: چونکہ میں سیاست دان نہیں تھا۔ میں تو برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کا سرونٹ تھا لیکن سیاست دانوں سے ملنا جلنا ہوتا تھا جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ دہلی میں جناح صاحب میرے گھر کے ساتھ ہی رہتے تھے لیکن کبھی دُعا سلام کے علاوہ سیاست پر بات نہیں ہوئی۔ چونکہ میں سرکاری ملازم تھا اِس لیے سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا لیکن میرے ساتھ دہلی یونیورسٹی میں اشتیاق حسین قریشی صاحب تھے وہ یونیورسٹی چھوڑ کر سیاست میں آ گئے۔ میری اُن سے ملاقات ضرور ہوتی رہتی تھی۔

سوال: کیا پاکستان میں آنا حالات کی جبریت تھی یا آزادیِ رائے کا اظہار تھا؟

جواب: چونکہ ہم کشمیری مسلمان ہیں اور ہمارا خیال تھا کہ کشمیر پاکستان میں آجائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ برٹش گورنمنٹ نے اُس وقت Option دیا تھا کہ تم ہندوستان میں رہنا چاہتے ہو یا پاکستان میں۔ والد صاحب نے مجھ سے کہا بے شک تم پاکستان چلے جاؤ اور کشمیر پاکستان میں آجائے گا تو ہم اپنے گھر کشمیر (متوقع پاکستان) آجائیں گے لیکن بدقسمتی سے میرے خیال میں جناح صاحب کو کشمیر میں اتنی زیادہ دلچسپی نہیں تھی جتنی کہ حیدر آباد دکن سے تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح حیدر آباد دکن پاکستان کا حصہ بن جائے کیونکہ حیدر آباد دکن کا نواب جناح کا دوست تھا اِس لیے وہ چاہتے تھے حیدر آباد دکن پاکستان آجائے۔ جناح نے کشمیر کا سوال کبھی اُٹھایا ہی نہیں تھا بلکہ پاٹیل نے ایک دفعہ اُن کو آفر کیا کہ آپ کشمیر لے لیں اور حیدر آباد دکن کو بھول جائیں لیکن ایسا نہیں ہوا اور دونوں کے دونوں ہمارے ہاتھ سے نکل گئے۔

سوال: پاکستان بن گیا مہاجرین جو یہاں آئے بڑی کرب ناک صورتِ حال دیکھتے ہیں کیا آپ نے فوراً ہجرت کی اُس وقت کیا صورتحال تھی؟

جواب: جب میرے بھائی دہلی میں آئے تو میں اِن کو دہلی سے لاہور سی آف کرنے کے بعد واپس دہلی جانے لگا تو دہلی میں فسادات اتنے زیادہ ہو گئے تھے کہ میں دہلی شہر کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ میرے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے۔ اُس نے کہا کہ بھئی تم کہاں جانا چاہتے ہو تو میں نے میری پوسٹنگ دہلی میں ہے اور میں وہیں جانا چاہتا ہوں اُس نے کہا دہلی میں تو فسادات ہو رہے ہیں تم وہاں کیسے پہنچو گے میں ابھی دہلی پہنچا ہی نہیں تھا کہ ریلوے اسٹیشن پر ایک خط مل گیا کہ تمہاری

پوسٹنگ ایسٹ پاکستان ہو گئی ہے۔ اُس زمانے میں ہم ایسٹ پاکستان کو نرگ سمجھتے تھے میں نے کہا اَب کیا بنے گا کیونکہ ہم تو مغربی پاکستان جانا چاہتے تھے لیکن میجر مویا نے میرا ٹرانسفر مشرقی پاکستان کر دیا۔ اُس زمانے میں مشرقی پاکستان میں آرکیالوجی کا کوئی ڈیپارٹمنٹ نہیں تھا۔ مجھے راج شاہی بھیج دیا گیا۔ میری شادی بھی اُنہی دِنوں ہوئی تھی۔ میری بیوی نے کہا تم مجھے کہاں نرگ میں لے آئے ہو میں تو یہاں نہیں رہوں گی۔ دو مہینے کے بعد وہ وہاں سے بھاگ کر بنگال آئی اور پھر وہاں سے واپس ہندوستان چلی گئی۔ میں نے سوچا کہ مجھے بھی ویسٹ پاکستان چلا جانا چاہیے تو میں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ جس دِن میں نے استعفیٰ دیا تھا اُسی رات مجھے ریڈیو پر Talk دینا تھی اور یہ Talk ڈھاکہ شہر پر تھی۔ میں نے Talk دی صبح اُٹھا کمرے میں ایک آدمی آیا کہ آپ کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بلا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں تو اُنہیں جانتا ہی نہیں۔ اُس آدمی نے کہا کہ اُنہوں نے رات کو ڈھاکہ شہر پر آپ کا Talk سنا ہے۔ وہ آپ کو بلا رہے ہیں میں اُن کے ساتھ چلا گیا وہ اُٹھ کر کھڑے ہوئے میرے ساتھ ہاتھ ملایا مجھے بٹھایا اور کہا کہ رات میں نے ڈھاکہ شہر پر تمہاری Talk سنی تھی۔ تم نے بہت اچھی Talk دی۔ اگر تم چاہو تو یونیورسٹی جوائن کر سکتے ہو۔ تقسیم سے پہلے ڈھاکہ یونیورسٹی میں پچھتر فیصد ہندو ٹیچر ہوا کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد وہ سب ہندوستان بھاگ گئے۔ اَب اُن کو کوئی ٹیچر ملتا ہی نہیں تھا میں نے کہا سر میں ڈھاکہ میں رہنا ہی نہیں چاہتا۔ میں نے ابھی استعفیٰ بھی دے دیا ہے ہم تو ویسٹ پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے کیا ہو گیا ہم انسان نہیں ہیں کیا یہ ملک نہیں ہے اُنہوں نے اُسی وقت اپنے پی۔ اے کو بلوایا اور ایک لیٹر Dectate کروایا اور کہا اِن کو ڈھاکہ یونیورسٹی کا پروفیسر بناؤ ایک مہینے کی چھٹی دو جانے آنے کا کرایہ دو اور اُن سے بولو کہ یہ لاہور جائیں اور اپنی بیوی کو لے آئیں۔ اِس طرح مجھے ڈھاکہ یونیورسٹی میں جاب مل گئی اور دس سال تک میں وہاں پڑھاتا رہا۔

سوال: آپ بنارس یونیورسٹی سے پڑھے ہیں۔ سنا ہے کہ بنارس اور علیگ (علی گڑھ) سے پڑھے ہوئے لوگوں میں زیادہ دوستی نہیں تھی اِس حوالے سے کچھ بتائیں؟

جواب: اُس زمانے میں مسلمان ہندو یونیورسٹی بنارس نہیں جاتے تھے۔ زیادہ تر علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ میرے چاچا بھی علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے لیکن چونکہ ہم ناگ پور یونیورسٹی میں ہندی اور سنسکرت پڑھتے تھے وہاں پر ایک پروفیسر مراشی تھے اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے ہندی اور سنسکرت تو پڑھ لی ہے اَب تم ہندوؤں کو سمجھنے کے لیے بنارس چلے جاؤ۔ اُنہوں نے مجھے وہاں سے بنارس بھیج دیا۔ جب میں پاکستان .Opt کیا تو میرے کچھ ساتھی جو علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے جو یہ جانتے تھے کہ میں ہندی بھی جانتا ہوں اور سنسکرت بھی اُنہوں نے کہا اِس پٹھے کو ویسٹ پاکستان نہیں آنے دینا۔ اُنہوں نے مجھے ایسٹ پاکستان ٹرانسفر کر دیا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب ۱۹۷۴ء کے بعد آپ پاکستان تشریف لائے۔ پاکستان آنے کے بعد آپ کن اداروں سے منسلک رہے؟ کن یونیورسٹیوں میں رہے؟ اِس پورے سفر کی داستان کیا ہے؟

جواب: ۱۹۷۴ء سے پہلے میں برٹش گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازمت کرتا تھا جب میں نے پاکستان Opt. کیا تو مجھے ایسٹ پاکستان ٹرانسفر کر دیا گیا۔ ایسٹ پاکستان میں میرا Sperior Officer شمس الدین احمد تھا جو کہ بنگالی مسلمان تھا۔ چونکہ ڈھاکہ میں کوئی آرکیالوجی کا ڈیپارٹمنٹ نہیں تھا تو اُس نے مرشد آباد میں اپنے گھر کے نزدیک ڈیپارٹمنٹ آف آرکیالوجی کھول لیا اور میری پوسٹنگ وہاں پر ہوگئی۔ اِس کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں میری جاب ہوگئی اور دس سال تک میں بنگلہ دیش میں رہا اِس کے بعد پشاور یونیورسٹی چلا آیا اور ۱۹۷۱ء میں قائداعظم یونیورسٹی کو جوائن کیا۔

سوال: آپ کا آرکیالوجی کی طرف کیسے آنا ہوا؟ اُس وقت اور بھی مضامین تھے آپ نے اِس شعبے کا انتخاب کیوں کیا؟

جواب: جیسا کہ میں پہلے بتایا کہ انگریزوں کے زمانے میں ایک انگریز آرکیالوجسٹ سر مارٹی مروھیلر کو ہندوستان میں بھیجا گیا۔ اُس نے کئی یونیورسٹیوں سے تقریباً پچاس سٹوڈنٹ کو جمع کیا اور دہلی میں لاکر اُن کو ٹریننگ دی۔ میں بھی اُن میں شامل تھا اور یہیں سے میری دلچسپی کا آغاز ہوا۔

سوال: آپ نے بنگال کی آرکیالوجی بنائی، پورے ویسٹ پاکستان کی آرکیالوجی بنائی۔ کوئی ایسا تجربہ جو چونکا دینے والا ہو؟

جواب: میرے خیال میں ہم نے لٹریچر میں آریاؤں کے متعلق پڑھا تھا۔ ابھی بھی لوگ پڑھتے ہیں سنسکرت کا ترجمہ انگریزی میں ہوگیا ہے لوگ پڑھتے ہیں لیکن آریاؤں کی آرکیالوجی کا کسی کو پتہ نہیں تھا اس زمانے میں میری پوسٹنگ جب ڈھاکہ سے پشاور ہوئی وہاں وائس چانسلر محمد علی صاحب تھے جو ایوب خان کے دوست تھے مجھے محمد علی صاحب نے بلایا اور کہا کہ ہم نے آپ کی Appointment تو کر دی ہے ایوب خاں کے کہنے پر ایوب خان سے پہلی ملاقات ڈھاکہ میں ہوئی تھی جب وہ میجر جنرل تھے وائس چانسلر نے پوچھا اب آپ نے یہاں کیا کرنا ہے میں نے کہا سر میں نیا نیا پشاور میں آیا ہوں مجھے کیا معلوم کہ کیا کروں گا۔ لیکن میں نے اتنا سنا ہے کہ ایگزینڈر دی گریٹ اسی راستے سے باجوڑ سے دیر، دیر سے سوات پھر سوات سے مردان گیا تھا۔ میں بھی اسی راستے پہ جاؤں گا۔ مجھے آپ ایک آدمی دے دیں جو یہاں کا رہنے والا ہو۔ ایک گاڑی دے دیں اور پیٹرول کے لیے پیسے دے دیں۔ میں اسی راستے پر جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ آرکیالوجی کے کوئی نمونے ہیں بھی یا نہیں۔ انہوں نے مجھے ایک پروفیسر ڈاکٹر منور خان جو ہسٹری ڈیپارٹمنٹ سے تھے ان کو میرے ساتھ بھیجا اور کہا کہ آپ ان کے ساتھ جائیں اور جہاں یہ جانا چاہتے ہیں ان

کو لے جائیں۔ منور خان صاحب سوات کے رہنے والے تھے اس لیے سب سے پہلے مجھے وہ اپنے علاقے تھانہ سوات لے گئے رات کو ہم کھانا کھا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ گاؤں والے بھی آ گئے گاؤں والوں نے پوچھا یہ کون آدمی ہے جس کو تم یہاں لے آئے ہو منور خان نے مجھ سے کہا ان کو بتاؤ کہ اردو میں آرکیالوجی کو کیا کہتے ہیں۔ ہم اگر یہاں آرکیالوجی کہیں گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ یہ کیا بلا ہے میں نے کہا تم ایک کام کرو میں انگریزی بولتا جاتا ہوں تم پشتو میں اس کا ترجمہ کرتے جاؤ میں نے انگریزی میں بتایا اور منور خان اس کا ترجمہ پشتو میں کرتے رہے ان میں سے ایک آدمی نے کہا اچھا آپ کافروں کی قبر کو بھی دیکھتے ہیں میں نے کہا آپ کو کیسے معلوم کہ یہ کافروں کی قبر ہے مجھ سے کہنے لگا کہ مسلمانوں کی قبر تو ایسا ایسا ہوتا ہے جب کہ کافروں کی قبر ایسا ایسا ہوتا ہے۔ میں نے کہا تم مجھے صبح دکھاؤ میں تمہیں سو روپے دوں گا۔ پھر وہ صبح مجھے لے گیا تو ہم نے دیکھا کہ وہاں پر بدھ کے زمانے سے بھی پہلے کی قبر تھی۔ پھر وہاں سے ہم دیر چلے گئے دیر سے باجوڑ اور میں نے پہلی دفعہ ریڈیو میں یہ خبر دی اور اخبار میں بھی لکھا کہ ہم نے آریاؤں کی قبر کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ وہ خبر جب میں نے شائع کی جو نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان، انگلستان امریکہ اور پوری دنیا میں شائع ہوئی۔ وائس چانسلر نے مجھے بلایا اور کہا یہ تم نے پشاور یونیورسٹی کا نام پوری دنیا میں پھیلا دیا ہے میں نے کہا میں نے تو صرف یہ بتایا تھا کہ آریاؤں کی قبر ملی ہے تو اس طرح میں نے پہلی دفعہ ہندوستان اور پاکستان میں آریاؤں کی آرکیالوجی دریافت کی۔

سوال: ۱۹۴۷ء کے بعد آپ ڈھاکہ گئے، ڈھاکہ یونیورسٹی جوائن کی اس وقت ایوب خان میجر جنرل تھے آپ کی ان سے ملاقات ہوئی اور جب وہ صدر بنے تو انہوں نے آپ کو پشاور لانے کی کوشش کی۔ بنگال سے پشاور تک کے سفر کا احوال بتائیں؟

جواب: ڈھاکہ میں جب ایوب خان میجر جنرل تھے تو ان کے کمانڈر انچیف کرنل کا چچا میرا کلرک تھا تو ایک دن اس کے چچا نے مجھے چائے پر بلایا کرنل بھی آیا ہوا تھا اس سے میری ملاقات ہوگئی اس نے کہا آپ آرکیالوجی بھی جانتے ہیں کسی وقت میرے پاس آئیں تو تفصیلی بات کریں گے۔ میں ان کے پاس آفس چلا گیا انہوں نے کہا آؤ ایوب خان کے ساتھ چائے پیتے ہیں۔ میں نے کہا ایوب خان کے ساتھ کیسے چائے پئیں گے وہ تو بہت بڑا آفیسر ہے اس نے کہا نہیں ایوب خان کے ساتھ اکٹھے چائے پیتے ہیں۔ مجھے ایوب خان کے پاس لے گئے چائے پلائی اور چار گھنٹے تک ایوب خان نے مجھے نہیں چھوڑا دنیا بھر کی آرکیالوجی کے بارے میں مجھ سے پوچھتے رہے بنگال میں آرکیالوجی کیسی ہے؟ ہندوستان میں آرکیالوجی کیسی ہے؟ یورپ میں آرکیالوجی کیسی ہے؟ یہ سب کچھ پوچھتے رہے جب وہ صدر بنے تو پشاور میں وائس چانسلر محمد علی تھے ان سے انہوں نے کہا میں ایک ایسے آدمی سے ملا ہوں جن کا نام تو مجھے یاد نہیں اس کو یہاں بلا لیں تو مجھے بڑی مشکل سے

میرا پتہ معلوم کیا اور مجھے ایک خط لکھا کہ صدر صاحب یہ چاہتے ہیں کہ آپ پشاور آ جائیں تو ایوب خان کے کہنے پر میں پشاور چلا آیا پہلی دفعہ ڈیپارٹمنٹ آف آرکیالوجی پشاور یونیورسٹی میں میں نے کھولا اس سے پہلے پاکستان میں آرکیالوجی کا کوئی ڈیپارٹمنٹ نہیں تھا۔

سوال: پاکستان بننے کے بعد جب آپ آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ سے منسلک ہوئے اور آپ نے آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ بنایا پھر ۱۹۷۱ء میں قائداعظم یونیورسٹی میں بھی آپ نے آرکیالوجی پر کام کیا پھر اس کے بعد آپ کی کئی کتابیں اور بے شمار ریسرچ آرٹیکل شائع ہوئے پاکستان میں آپ نے اس روٹ کو بھی دیکھا جس پر الیگزینڈر دی گریٹ نے سفر کیا اور آپ نے آریاؤں کے حوالے سے بہت اہم دریافت کی کیا آپ سمجھتے ہیں یہ دریافت پہلے بھی ہوئی تھی یا آپ نے دریافت کیا؟

جواب: میرے خیال میں ایشیا میں آریاؤں کی آرکیالوجی کے متعلق کسی کو پتہ نہیں تھا۔ یورپ میں تو پتہ تھا وہاں گارڈن چائلڈ نے آریاؤں کو یورپ میں ڈسکور کیا لیکن ایشیا میں کسی کو نہیں پتہ تھا مگر میں نے پہلی دفعہ پاکستان میں آریاؤں کی آرکیالوجی خاص کر دیر اور سوات میں ڈسکور کیا۔ اور دنیا کے سامنے پھیلایا میں اس وقت پشاور یونیورسٹی میں تھا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب آپ کے ذہن میں کوئی ایسا نام آ رہا ہے کوئی تاریخ دان یا آرکیالوجسٹ جو آپ کا ہم عصر رہا ہو اور جس نے آپ کو متاثر کیا ہو؟

جواب: مجھے سب سے زیادہ انگریز آرکیالوجسٹ سر مارٹیمر وھیلر نے بہت زیادہ متاثر کیا جب انگریزوں کی ہندوستان میں حکومت تھی انگریزوں نے اسے انگلینڈ سے دلی بلایا اور آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں بطور ڈائریکٹر جنرل تعینات کیا اس نے مجھے بھی سلیکٹ کیا اور اپنے انداز سے مجھ سے کام کروایا۔

سوال: جو کتب آپ شائع کر چکے اور جتنے آرٹیکل آپ لکھ چکے ہیں اس میں کہیں شناخت کے حوالے سے اگر آج کا پاکستانی اپنی شناخت کو ڈھونڈنا چاہے تو کیا وہ وسط ایشیا کا حوالہ ڈھونڈے گا یا Middle East یا پھر برِصغیر کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑے گا؟

جواب: میں تو یہ کہتا ہوں کہ پاکستان کی شناخت جو ہے پاکستان اور انڈس لینڈ کو دونوں کو برابر سمجھتا ہوں۔ انڈس لینڈ میں جو آبادی موجود ہے اس کا ساٹھ فیصد وسط ایشیا سے آیا ہے اس وقت بھی میں جب آپ کا چہرہ دیکھتا ہوں اور پھر بخارا، سمرقند جاتا ہوں تو میں سوچتا ہوں یہ پاکستانی یہاں کیسے آ گیا ہمارا جو چہرہ ہے (پاکستان) اس کا ساٹھ فیصد بلڈ وسط ایشیا کا ہے اسلام بھی ہم نے عرب سے نہیں لیا اسلام بھی ہم نے بخارا، سمرقند سے لیا وہاں سے درویشوں نے آ کر اسلام پھیلایا یا ہمارا رشتہ جو وسط ایشیا کے ساتھ رہا ہے نہ صرف اسلام کے بعد بلکہ اس سے پہلے بدھ ازم کے زمانے میں بھی ہمارے یہاں سے بدھ ازم وسط ایشیا گیا یہاں سے بدھ لوگ وہاں جا کر لوگوں کو بدھ

بناتے تھے اور بعد میں وہاں سے اسلام یہاں آیا۔

سوال: قائداعظم یونیورسٹی میں یا مختلف یونیورسٹیوں میں جب آپ نے پڑھانا شروع کیا تو کون کون سے سبجیکٹ آپ نے پڑھائے؟

جواب: میں نے یہاں زیادہ تر تاریخ پڑھائی اور شعبہ تاریخ میں بھی ایشیا کی ہسٹری پڑھاتا رہا ہوں یورپ کی نہیں پڑھائی اور ایشیا کی ہسٹری میں میں ان کو یہی بتاتا ہوں کہ اس وقت پاکستان میں جو لوگ آباد ان کا ساٹھ فیصد بلڈ وسط ایشیا سے آیا ہوا ہے عرب سے نہیں۔ اسلام انہوں نے وسط ایشیا سے لیا ہے عرب سے نہیں محمد بن قاسم جب آتا ہے تو وہ صرف سندھ تک آتا ہے اس سے آگے نہیں گیا لیکن باقی لوگ وسط ایشیا سے آتے ہیں یا سمرقند یا بخارا سے آتے ہیں۔

سوال: آپ نے بلڈ ریلیشن کی بات کی، زبان کے حوالے سے بھی ہم دراوڑی حوالہ ضرور لیتے ہیں کیا پاکستان کی زبان کا قدیم حوالہ وہ تو نہیں بن جاتا؟

جواب: پاکستان میں جو قدیم زبان موہن جوداڑو کی تھی جس کا ہمیں آج تک پتہ نہیں چلا کہ وہ کیا زبان نہیں تھی کئی لوگوں کا خیال ہے خاص طور پر آسکو پارپولا جو سویڈن میں پروفیسر ہیں ان کا خیال ہے کہ یہاں کہ جو پرانی زبان تھی وہ دراوڑی تھی۔ میں نے کہا اگر یہ زبان دراوڑی تھی تو دراوڑ لوگ اگر یہاں سے ساؤتھ انڈیا گئے تو یہاں کہ تہذیب وہاں کیوں نہیں لے کر گئے میں نے کہا مجھے آپ بتائیں اگر آپ سویڈن سے یہاں آتے ہیں اور کئی برسوں سے آپ پاکستان میں آتے ہیں تو یہاں آ کر کیا پاکستانی کھانا کھاتے ہیں۔ کیا یہاں کا ڈریس پہنتے ہیں وہ ہی سویڈش ڈشز کھاتے ہیں سویڈن والا لباس پہنتے ہیں اگر دراوڑ یہاں سے ساؤتھ انڈیا گئے تو وہ وہاں کیا لے کر گئے یہاں سے انڈس تہذیب وہاں کیوں نہیں لے کر گئے وہاں تو ہمیں آج تک سندھ کی تہذیب کا کوئی نمونہ نہیں ملا۔

سوال: سر آپ جو پرانی زبانیں جانتے ہیں کیا آپ نے اپنی پرانی زبانوں کا کوئی جاں نشیں بھی پیدا کیا جو آپ کی طرح قدیم زبانیں جانتا ہو؟

جواب: پشاور یونیورسٹی میں میں نے اکثر طلباء کو یہ زبانیں سکھانے کی کوشش کی ان میں سے کچھ سیکھ بھی گئے مگر سب سے زیادہ جو میری زبان کو سمجھتا اور بولتا ہے وہ میرا پوتا نوروز سکندر دانی ہے ابھی اس کی عمر نو سال ہے وہ بہت ساری زبانیں بول لیتا ہے۔

سوال: سر آپ نے کبھی خواب دیکھے ہیں؟ یا آپ نے جوانی میں جو خواب دیکھے تھے اس کا کتنے فیصد پورا ہوا ہے؟

جواب: خواب یہ تھا کہ میں پروفیسر بنوں گا سیاستدان یا کسی اور شعبے میں جانے کا میرا کبھی کوئی خواب نہیں رہا اور میرے خوابوں کا شاید پچیس فیصد پورا ہوا ہو۔ اور اس حوالے سے مجھے بہت

سارے شکوے بھی ہیں۔

سوال: آپ نے چونسٹھ کتابیں لکھیں یہ کتابیں لکھنے کا سفر کہاں سے شروع ہوا؟

جواب: سب سے پہلی میری کتاب ڈھاکہ شہر پر ہے کیونکہ تقسیم کے بعد میری ٹرانسفر ڈھاکہ شہر میں ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے میں آگرہ میں تھا وہاں پر رہتے ہوئے میں نے کچھ نہیں لکھا۔ لیکن آگرہ میں رہتے ہوئے دنیا کے تقریباً ہر بادشاہ کو تاج محل دکھایا۔ ایک دفعہ جنرل ڈیگال برٹش کوئین کے مہمان بن کر آگرہ آئے برٹش کوئین نے اس زمانے کے وائسرائے کو ٹیلی فون کیا کہ آگرہ میں ان کو رسیو کرو وائسرائے نے گورنر کو فون کیا، گورنر نے کمشنر کو فون کیا اس نے ڈپٹی کمشنر کو فون کیا اور ڈپٹی کمشنر نے آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں ٹیلی فون کیا اس وقت میں آگرہ میں آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں تھا مجھ سے کہا گیا تھا کہ آپ نے جنرل ڈیگال کو تاج محل دکھانا ہے۔ مگر میں نے کہا تاج محل تو میں دکھادوں گا مگر میں تو فرنچ جانتا ہی نہیں انہوں نے کہا ڈونٹ وری آپ انگلش میں بولتے جائیں وہ انگلش جانتا ہے سمجھ لے گا۔ مگر انگریزی بولے گا نہیں۔ جنرل ڈیگال کو جب میں تاج محل لے گیا تو وہ سیدھا تاج محل کے اندر گھسنے لگا میں نے کہا نہیں نہیں آپ میرے ساتھ مشرقی دروازے پر آئیں وہاں دروازے پر میں آپ کو کھڑا کروں گا اور میں بتاؤں گا کہ تاج محل کیسا ہے دروازے کے درمیان ان کو کھڑا کیا میں نے کہا سیدھا دیکھیں۔ اب آپ کی ناک ممتاز محل کے ناک کے اوپر ہے۔ کہتے ہیں یہ کیسے میں نے کہا آپ سیدھا چلیں آپ کو پتہ چلے گا کہ آپ کی ناک اس کی ناک کے بالکل اوپر ہے۔

سوال: آپ نے مارٹیمر وھیلر کے ساتھ کام کیا، مارٹیمر وھیلر بہت بڑا نام ہے انہوں نے کتاب بھی لکھی ہے Five Thousands Years Of Pakistan اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: یہ کتاب وھیلر کے نام سے چھپی ہے لیکن وھیلر صاحب ویسٹ پاکستان کو تو جانتے تھے مگر ایسٹ پاکستان کو نہیں جانتے تھے۔ تو آدھی کتاب جو ایسٹ پاکستان پر ہے وہ میری لکھی ہوئی ہے آدھی اس کی ہے۔ لیکن چھپی انہیں کے نام سے ہے۔ انہوں نے صرف Preface میں میرا نام تھوڑا بہت لگا دیا ہے کہ اس نے میری مدد کی ہے جب بعد میں اس نے اس کا دوسرا ایڈیشن نکالنا تھا تو میں PHD کرنے لندن گیا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے دعوت پر بلایا اور کہا آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے Five Thousands Years of Pakistan نکالی تھی اب اس کا دوسرا ایڈیشن نکالنا ہے۔ میں نے کہا یہ کتاب تو میرے نام سے چھپی ہی نہیں آپ کے نام سے چھپی ہے آپ ہی اس کا دوسرا ایڈیشن نکالیں۔ لیکن اس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن نہیں نکلا۔

سوال: وھیلر جو کہ برٹش تھا اس کے بعد ہڑپہ میں اب مارک کنوئر وغیرہ کام کر رہے ہیں۔ ان کی تکنیک میں کوئی فرق ہے برٹش اور امریکن کی؟

جواب: میں نے بھی تقسیم سے پہلے ہڑپہ میں کام کیا تھا برٹش کی تکنیک جو خاص کر وھیلر کی تکنیک ہے اس نے Excovation کی تکنیک کو نکالا ہے وہ دنیا کی نئی تکنیک تھی اور دنیا میں کسی کو بھی اس کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ اس تکنیک میں یہ تھا کہ جب آپ Excavation کرتے ہیں تو بڑے سارے لیئر آتے ہیں۔ اور Dating ان لیئر کے حساب سے کرتے ہیں۔ اور پھر ہم اس کا Corbon Dating بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے لیئر کا سسٹم کسی کو پتہ نہیں تھا اور یہ معلوم نہیں تھا کہ مختلف لیئر میں مختلف Dating ہوتی ہے۔ وھیلر نے پہلی دفعہ یہ آرکیالوجی کو انگلینڈ میں شروع کیا اور اس کے بعد انڈیا میں۔

سوال: کننگھم نے قلعہ ملتان کے قریب جو کھدائی کی تھی وہ بھی لیئر کا ذکر کرتا ہے کہ بیس فٹ کی اتنی لیئر ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: اس زمانے میں اس تک یہ تکنیک نہیں پہنچی تھی اور لیئر کو آپ فٹوں میں تقسیم نہیں کر سکتے اور لیئر تو الگ الگ ہوتی ہے اس میں نیچرل لیئر بھی ہوتے ہیں۔

سوال: آپ نے اتنا بڑا کام کیا کیا کبھی امریکہ، جرمن، برطانیہ سے آفر نہیں آئی کہ آپ یہاں آکر کام کریں؟

جواب: مجھے تو بہت دفعہ آفر ہوئی آکسفورڈ میں مجھے کہا گیا کہ آپ یہیں رہ جائیں امریکہ میں جب Last Time گیا تھا تو انہوں نے بھی کہا کہ یہاں رک جائیں میں نہ صرف آرکیالوجی کو جانتا تھا بلکہ بہت ساری زبانیں بھی جانتا تھا لیکن میری وائف نے کہا کہ ہم امریکیوں کو پڑھائیں گے کیا ہم اپنے بچوں کو نہیں پڑھائیں گے کیوں نہ ہم اپنے ملک میں جائیں۔

سوال: (ساجد اعوان) آپ نے انداز کتنے لوگوں کو PHD کروائی ہوگی؟

جواب: میرے خیال میں میں نے تقریباً دو درجن سے زیادہ لوگوں کو PHD کروائی ہوگی۔

سوال: اب ہم اپنے ملتان کے گرد و نواح میں آتے ہیں۔ ملتان کی ہسٹری کے بارے میں مختلف نقطہ نظر ہے یہ ساڑھے تین ہزار سال پرانا شہر ہے۔ اور اس کے آثار ملحقہ علاقوں میں بھی ملتے ہیں آپ اس پٹی کو کس طرح سے دیکھتے ہیں؟

جواب: کیونکہ ملتان میں زیادہ Excavation نہیں ہوا پاکستان اور پاکستان سے باہر کے لوگ ہڑپہ یا موہن جوداڑو کو سب سے پرانا شہر مانتے ہیں اور تہذیب مانتے ہیں لیکن اب ہم نے وہ آثار ملتان میں بھی نکال لیے ہیں لوگوں کو بتایا ہے کہ جو آثار آپ کو ہڑپہ یا موہن جوداڑو میں ملتے ہیں وہ آثار ملتان میں بھی ملتے ہیں لیکن ابھی تک ملتان کی کھدائی نہیں ہو سکی لیکن یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ملتان شہر

اتنا ہی پرانا ہے جتنا موہن جودڑو۔فرق اتنا ہے کہ موہن جودڑو اور ہڑپہ شہر آباد ہوئے اور بعد میں ختم ہو گئے۔ملتان پورے پاکستان میں واحد پرانا شہر ہے جو ابھی تک آباد ہے۔

سوال: کیا ٹھٹھہ کی قدامت کا مقابلہ ملتان سے کیا جا سکتا ہے؟

جواب: بالکل کیا جا سکتا ہے بلکہ ٹھٹھہ پر میری ایک کتاب بھی اور وہاں کی جتنی مساجد اور درگاہیں ہیں ان کا ذکر میں اس کتاب میں کیا ہوا ہے اس کتاب کا نام بھی ٹھٹھہ ہے لیکن ملتان شہر ٹھٹھہ سے بھی پرانا ہے ملتان مسلمانوں سے پہلے کا شہر ہے جبکہ ٹھٹھہ کو مسلمانوں نے آباد کیا۔

سوال: آپ کا ایک اہم ترین کام انڈین پیلیو گرافی کے حوالے سے ہے۔پیلیو گرافی کے بارے میں ہمیں بتائیں کہ یہ کیا ہوتی ہے اور اس کے حوالے سے آپ نے کیا اہم کام کیا؟

جواب: پیلیو گرافی لکھنے کا طریقہ یا خط ہوتا ہے چاہے اردو کا ہو، فارسی کا ہو، عربی کا ہو یا ہندی کا ہو یا بنگالی کا ہو۔ان کے لکھنے کے جو طور طریقے ہوتے ہیں یا حروفِ تہجی ان کی سٹڈی کو ہم پیلیو گرافی کہتے ہیں میں جب لندن گیا تھا تو وہاں انگریز پروفیسر کے۔ایل باشم نے کہا کہ آپ اتنی زبانیں جانتے ہیں اس پر کتاب کیوں نہیں لکھتے میں نے کہا سر مجھے تو کسی نے کتاب لکھنے کو کہا ہی نہیں اگر کتاب لکھوں گا تو پیسے کون دے گا پروفیسر بیشم نے کہا تم کیوں گھبراتے ہو پیسے ہم آپ کو دلا دیں گے اس نے Ford Foundation کو خط لکھا اور مجھ سے کہا کہ ہم آپ کو ایک سال کی تنخواہ دیتے ہیں آپ یہاں لندن میں رہ کر کام کریں میں نے پروفیسر بیشم سے کہا یہ ممکن نہیں کہ میں ایک سال میں یہ سارا کام کر سکوں ان سے کہیں کہ مجھے اتنے سالوں کے لیے اتنی تنخواہ دیں تا کہ میں تسلی سے کام کر سکوں۔میں اس وقت ڈھاکہ یونیورسٹی میں کام کرتا تھا۔اس وقت وہاں جسٹس حمود الرحمٰن وائس چانسلر تھے۔جسٹس حمود الرحمٰن نے کہا تمہیں ایک سال کے اندر ڈھاکہ واپس آنا ہے۔نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس زمانے میں □Œ□¤□ Indus Civilization Writing, □'□□□£□š□Ž کرنے میں لگا ہوا تھا لیکن حمود الرحمٰن کی وجہ سے میں وہ کام مکمل نہ کر سکا۔مجھے پورا یقین ہے کہ میں اس کو ڈی سائفر کر لیتا پر پروفیسر بیشم مجھے مکمل طور پر بیک اپ کر رہا تھا۔وہ کہتا تھا کہ جب تک تم یہاں رہنا چاہو ہم تمہیں پیسے دیتے ہیں تم یہ کام مکمل کرو۔لیکن بدقسمتی سے حمود الرحمٰن نے کہا ایک سال بعد تم کو ڈھاکہ واپس آنا ہے۔آج بھی مختلف لوگ اس پر کام کر رہے ہیں۔جن میں آسکو پارپولا جو کہ سویڈش سکالر ہے وہ بھی اسی کام میں لگا ہوا ہے۔اس کے علاوہ مدراس میں انڈیا کا پروفیسر اور ایک امریکن خاتون بھی اس پر کام کر رہی ہے لیکن آج تک یہ ڈی سائفر نہیں ہو سکا۔

سوال: آپ نے بتایا کہ ۱۹۷۱ء میں آپ نے قائداعظم یونیورسٹی جوائن کی۔آپ نے سوشل ڈیپارٹمنٹ قائم کیا اس حوالے سے کچھ بتائیں؟

جواب: میں جب اسلام آباد میں آیا تھا تو اس وقت یہاں رجسٹرار حسن شاہ تھا۔اس کی بیوی پشاور وومین کالج میں پرنسپل تھیں۔ہم بھی پشاور میں رہتے تھے اس کی وائف کا ہمارے گھر آنا جانا تھا تو اس نے کہا کہ ہم دونوں پشاور چھوڑ کہ اسلام آباد جاتے ہیں۔میں نے کہا اسلام آباد میں کہاں جائیں گے اس نے کہا دنیا بہت وسیع ہے کہیں نہ کہیں تو نوکری مل ہی جائے گی۔وہ بھی پشاور چھوڑ کر اسلام آباد آ گئی اور میں بھی آ گیا۔قائداعظم یونیورسٹی میں اس وقت سائنس کے مضامین پڑھائے جاتے تھے آرٹس کا کوئی ڈیپارٹمنٹ نہیں تھا۔ابتدائی دنوں میں میں حسن شاہ صاحب کے ہی گھر ٹھہرا کچھ دن وہاں رہا پھر کراچی چلا گیا ممتاز حسن سے میری دوستی ڈھاکہ میں ہو گئی تھی۔یہ وہ ہی ممتاز حسن ہے جو فنانس سیکرٹری بھی رہے۔اور ممتاز حسن سے میری دوستی شیخ اکرام جنہوں نے موجِ کوثر اور آبِ کوثر لکھی ہیں انہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ممتاز حسن اس وقت پاکستان میں فنانس سیکرٹری تھے۔جب میری نوکری ختم ہوئی تو مجھ سے اُنہوں نے پوچھا اَب تم کیا کرو گے؟ میں نے کہا کرنا کیا ہے اللہ مالک ہے اُنہوں نے کہا اچھا میں اَبھی آپ کو نوکری دلاتا ہوں۔اُسی وقت اُنہوں نے قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے رجسٹرار حسن شاہ صاحب کو ٹیلی فون کیا کہ میں اِس شخص کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں اِس کو فوراً نوکری دلا دو۔اُس زمانے میں قائداعظم یونیورسٹی میں صرف سائنس پڑھائی جاتی تھی، آرٹس یا سوشل سائنسز کا کوئی مضمون نہیں پڑھایا جاتا تھا۔حسن شاہ نے ممتاز حسین سے پوچھا کہ یہ کون سا مضمون پڑھے ہوئے ہیں۔ممتاز حسین نے کہا یہ تو سائنس پڑھا ہی نہیں، یہ تو خالی ہسٹری اور لینگوئج پڑھا ہوا ہے۔حسن شاہ نے کہا اچھا آپ اِس کو بھیج دیں میں وائس چانسلر سے ملواتا ہوں۔اُس وقت قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں رضی الدین صدیقی جامعہ عثمانیہ والے وائس چانسلر تھے۔حسن شاہ صاحب مجھے وائس چانسلر کے پاس لے گئے۔وائس چانسلر نے کہا ہم تو یہاں سوشل سائنس پڑھاتے ہی نہیں لیکن تمہارے لیے میں سوشل سائنسز کے مضامین شروع کر دیتا ہوں۔اِس طرح اُنہوں نے مجھے نوکری دی اور میں نے پہلی دفعہ سوشل سائنسز کے مضامین شروع کروائے۔اِس سے پہلے نہ وہاں لینگوئج پڑھائی جاتی تھی اور نہ ہی ہسٹری۔

سوال: سوشل سائنس میں پہلا مضمون کون سا شروع کیا گیا؟

جواب: سب سے پہلے میں نے ہسٹری شروع کروایا۔

سوال: آپ قائداعظم یونیورسٹی میں سوشل سائنسز کے ڈین بھی رہے کبھی وائس چانسلر بننے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی؟

جواب: ۷۵-۱۹۷۱ء میں جب بھٹو صاحب پاکستان کے سربراہ بنے تو اُنہوں نے آفر کیا کہ آپ وائس چانسلر بن جائیں۔میں نے کہا بھٹو صاحب آپ کی آفر کا بہت بہت شکریہ لیکن ساری دنیا مجھے

پروفیسر کے نام سے جانتی ہے میں وائس چانسلر بن کر کیا کروں گا اور اِس طرح میں نے اُن کی آفر کو قبول نہیں کیا۔

سوال: آپ کو ایک دفعہ جرمن نے ٹیکسلا میں یونیورسٹی بنانے کی آفر کی اِس کی مختصر داستان بتائیں؟

جواب: ایک جرمن پروفیسر ای۔ایس ناسا اُن کی بڑی دلچسپی تھی کہ چترال یا نادرن ایریا میں یونیورسٹی بنے۔ میری اُن سے پہلے ملاقات نہیں تھی۔ ایک دفعہ وہ یہاں آئے، اُن کو پتہ چلا کہ فلاں شخص ہے جو پرانی زبانوں کو جانتا ہے وہ میرے پاس آئے مجھ سے کہا پروفیسر دانی چیلاس میں ایک کتبہ ہے آپ اُس کو ڈی سائفر کر دیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے ایک کتبہ ہے ایک آدھ گھنٹے میں ہو جائے گا ہم وہاں پہنچے تو شام ہوگئی۔ میں نے کہا رات میں سو لیا جائے صبح اُٹھ کر دیکھ لیں گے۔ صبح اُٹھے ایک کتبہ دیکھا، دو دیکھے، تین دیکھے میں نے کہا پروفیسر صاحب آپ تو کہتے تھے کہ ایک کتبہ ہے مجھے تو یہاں سینکڑوں کتبے نظر آرہے ہیں۔ کہنے لگا ہم تو اِنہیں پہچان نہیں سکتے ہم کیا کریں۔ میں نے کہا آپ پاک جرمن ریسرچ سوسائٹی بنائیں اور پاکستان گورنمنٹ کو یہ کہیں کہ بے شک آپ ہمیں پیسہ نہ دیں لیکن پروفیسر دانی کو ہمارے حوالے کر دیں۔ پیسہ ہم جرمنی سے لائیں گے اور نادرن ایریا میں کام کریں گے۔ ہم نے اُن سے مل کر دس سال تک کام کیا پرانی زبانوں میں جتنے بھی وہاں پر کتبے موجود تھے میں نے اِن کو ڈی سائفر کیا اور اُن کا ترجمہ کیا اور اِس خطے کی پہلی ہسٹری Hisotry of Notheren Areas of Pakistan کے نام سے لکھی اِس سے پہلے اِس خطے کی ہسٹری نہیں لکھی گئی تھی۔

سوال: آپ نئے طالب علموں کے لئے کیا تجویز کریں گے اگر اُنہوں نے ڈاکٹر دانی بننا ہو تو وہ کیا کریں؟

جواب: یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہوتی ہے جس کی Basis پر آپ کام کرتے ہیں جب تک طالب علم محنت نہ کریں، اُن کی دلچسپی نہ ہو وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔

سوال: آثارِ قدیمہ کے حوالے سے بطور Subject یونیورسٹیوں میں بہت کم پڑھایا جاتا ہے کیا ایسا ممکن نہیں کہ اِس کے کوئی ایسے شارٹ کورسس ہوں اُن لوگوں کے لیے جو اِس کا شوق رکھتے ہیں اور آثارِ قدیمہ پر کام کرنا چاہتے ہیں؟

جواب: تقسیم سے پہلے دہلی میں سر مارٹی مروھیلر نے ایسے شارٹ کورسس کا اجراء کیا تھا میں نے بھی وہیں سے آرکیالوجی کا کورس کیا۔ اِس کے بعد پروفیسر سرکالیا نے بھی پونا میں ایسے کورسس شروع کروائے جب کہ پاکستان میں پہلی دفعہ میں نے پشاور یونیورسٹی میں آرکیالوجی کو Introduce کروایا اور یہاں میرے خیال میں دنیا مجھے اگر جانتی ہے تو اِس کا معتبر حوالہ یہی ہے کہ اِس شخص نے برصغیر میں پہلی دفعہ آریاؤں کی آرکیالوجی اُجاگر کیا۔ اِس سے پہلے آریاؤں کی آرکیالوجی کا

پاکستان اور ہندوستان میں کسی کو نہیں پتہ تھا۔

سوال: کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ ایک ایسا کورس ڈیزائن کریں جو محدود مدت کا ہو اور جو لوگ اِس کا شوق رکھتے ہوں وہ اِس علم کو حاصل کر کے اِس کام کو مزید آگے بڑھا سکیں۔

جواب: آج بھی ہم اِن کورسس کو شروع کر سکتے ہیں جو تین یا چھ ماہ کے ہوں۔ مگر کم از کم چھ ماہ کا دورانیہ ہونا چاہیے تاکہ نئے آنے والے آرکیالوجی کے متعلق پورا جان سکیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے لوگ اِس کام کو سیکھنا چاہتے ہیں اور آگے آنا چاہتے بلکہ پاکستان سے باہر کے لوگ بھی اِس میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن بدقسمتی سے اِن باتوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی مثلاً جب میں نے قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں اپنی جاب شروع کی تو اُس وقت کے وائس چانسلر رضی الدین رضی نے مجھے بلوایا اور کہا کہ پروفیسر دانی ہم نے تم کو نوکری تو دے دی ہے مگر ہماری ایک شرط ہے کہ تم یہاں پر آرکیالوجی کا Subject نہیں پڑھاؤ گے۔

سوال: آپ نے ایک انٹرنیشنل سوسائٹی بنائی ''سوسائٹی آف ایشین سویلائزیشن'' اِس کے پلیٹ فارم سے آپ کو ملتان میں بھی Invite کیا گیا۔ اِس حوالے سے سوسائٹی کے بارے میں اور ملتان کے وزٹ کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب: ہمارا ایک ڈیپارٹمنٹ ہے ''سوسائٹی آف ایشن سویلائزیشن'' اِس میں ہم ایشیا کی ہسٹری پڑھاتے ہیں۔ آرکیالوجی، کلچر، تہذیب یہ سب کچھ پڑھاتے ہیں لیکن یہ سب اُن کے لیے ہے جو یہاں سٹوڈنٹ بن کر آتے ہیں۔ ایم۔اے کرنا چاہتے ہیں یا پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن اگر کوئی عام آدمی جو آرکیالوجی پڑھنا چاہے یا اِس کی دلچسپی ہو تو اُن کے لیے ہم نے یہ آرکیالوجیکل سوسائٹی بنائی ہے۔ غضنفر مہدی صاحب ہمارے سیکریٹری ہیں شاید آپ اِن کے نام سے واقف ہوں۔ اِس سوسائٹی کے تحت ہماری کوشش ہوتی ہے کہ مہینے میں ایک دفعہ ہم لوگوں کو اسلام آباد سے باہر لے جائیں۔ اِن لوگوں میں اکثر سکالر، ملکوں کے سفیر یا پروفیسرز ہوتے ہیں۔ ہم اِن کو اِسلام آباد سے باہر مختلف جگہوں پر لے جاتے ہیں، وہاں کی تاریخ بتاتے ہیں، آرکیالوجی بتاتے ہیں اور وہاں کا کلچر بھی بتاتے ہیں۔

سوال: آپ کا فکری سفر یقیناً جاری ہوگا اور آج بھی ہمیں یقین ہے کہ آپ اِسی انداز سے لکھ رہے ہوں گے آج کل آپ کس پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں؟

جواب: اِن دنوں میں دو پروجیکٹس پر کام کر رہا ہوں؟ ایک تو میری بیوی نے مجھ سے کہا بھئی تم ساری دنیا کی ہسٹری لکھ رہے ہو کبھی اپنی فیملی کی ہسٹری بھی تو لکھو۔ میں نے کہا میں اکیلا تو نہیں لکھوں گا تم بھی میرے ساتھ بیٹھ کر یہ ہسٹری لکھو۔ ہم دونوں اپنی فیملی کی ہسٹری لکھیں گے اور یہ ہسٹری انگریزی میں نہیں بلکہ اُردو میں لکھیں گے۔ بدقسمتی سے میری اُردو میری بیوی سے زیادہ کمزور ہے

(قہقہہ مارتے ہوئے)۔ میں نے کہا میں بولتا جاؤں گا تم لکھتی جاؤ کیونکہ میری اُردو کی املا بہت کمزور ہے۔ یہ ایک قسم کی آٹو بائیوگرافی ہوگی آج کل میں اِس پر کام کر رہا ہوں۔ دوسرا جس میں میری بہت زیادہ دلچسپی ہے سنٹرل ایشیاء کی ہسٹری ہے۔ اِس سے میری بہت زیادہ دلچسپی ہے کیونکہ جتنا زیادہ میں نے سنٹرل ایشیاء کو دیکھا ہے شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔ ایک دفعہ پاکستان میں ازبکستان کے سفیر میرے گھر آئے مجھ سے کہنے لگے دانی صاحب میں آپ کے گھر اِس لیے آیا ہوں کہ مجھے بتائیں کہ ترکمانستان سے ازبکستان کس طرح جاتے ہیں۔ میں نے کہا سر ازبکستان آپ کا ملک ہے میرا تو نہیں آپ بتائیں کہ کس طرح جاتے ہیں۔ کہنے لگا آپ تو گئے ہیں لیکن میں نے کبھی ایسا سفر نہیں کیا اِس کے بعد میں نے اُن کو بتایا کہ کدھر سے جاتے ہیں، کون سا راستہ ہے وہاں کی آرکیالوجی کیسی ہے وہاں کی ہسٹری کیا ہے؟ اور اُن کو یہ بھی بتایا کہ آپ کے مرو بہت بڑا اور اچھا شہر ہے اور مرو سے بہت سارے درویش ہمارے یہاں لاہور آئے ملتان بھی آئے اور یہی آباد ہوئے اور ہمارا اور آپ کا تعلق اتنا زیادہ ہے کہ میرے خیال میں Sixty Percent of Blood of Pakistanis are from Central Asia.

سوال: آپ کی ۶۴ کتابیں شائع ہوئیں جن میں زیادہ تر انگریزی زبان میں شائع ہوئیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ اِن میں سے جو اہم ہیں اُن کو اُردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں؟

جواب: انگریزی کے علاوہ میری کچھ کتابیں اُردو اور بنگالی میں بھی ہیں اور جو انگریزی میں ہیں اُن میں بعض کتابوں کو ضرور اُردو میں ترجمہ کیا جانا چاہیے تاکہ ہمارے طالب علم جو تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں اِن سے استفادہ کر سکیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب جو نئے لوگ آرکیالوجی کی فیلڈ میں آ رہے ہیں اِن کے لیے کوئی پیغام؟

جواب: میں تو یہی کہوں گا کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی یہاں موہنجوداڑو کے زمانے سے بلکہ اِس سے بھی پہلے دراوڑ سے لے کر یہاں تہذیب پنپتی رہی ہے تو میں چاہوں گا کہ عام لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ ہم نہ صرف اسلام ہی کو مانتے ہیں اور نہ صرف مسلمان ہیں بلکہ وادی سندھ کے رہنے والے ہیں ہمارا کلچر، ہماری تہذیب، ہماری تاریخ قدیم ترین زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ میرے خیال میں جو کلچر اور تہذیب ہم نے یہاں بنائی ہے وہ مٹنے والی نہیں ہم اِس کو آگے بڑھانے والے ہیں۔

***

ڈاکٹر روبینہ شاہجہاں

عالمگیریت اور ادب

سب سے پہلے ''عالمگیریت'' (Globalization) کی اصطلاح قابل غور اور وضاحت طلب ہے۔ یہ اصطلاح اپنے مفہوم میں نہایت وسعت رکھتی ہے اور اسے مختلف انداز سے سمجھا گیا اور سمجھا جاتا رہے گا۔ اس کو سمجھنے کے لیے تین طرح کے رویّے سامنے آئے ہیں۔ مثبت، منفی اور مزاحمتی۔ چونکہ منفی رویہ بھی موجود ہے اس لیے اس کے اندر سے مزاحمت سامنے آتی ہے۔

مثبت انداز نظریہ ہے کہ ترقی کے اعتبار سے اتصال آسان ہو گیا۔ دنیا سکڑ گئی اور فیصلے سکڑ گئے۔ گلوبل ولیج (Global Village) پچھلی صدی کی اصطلاح ہے جس میں یہ کہا جاتا رہا کہ "It's a small world" اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا کا رقبہ کم ہو گیا بلکہ اس کے سکڑنے سے مراد یہ ہے کہ مواصلاتی نظام (پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا) اور ذرائع آمدورفت اتنے تیز رفتار اور ترقی یافتہ ہو گئے کہ دنیا اپنی ساری وسعت اور تنوع کے باوجود سکڑی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اب دنیا والے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ عالمگیر منظر نامہ ابھر رہا ہے۔ سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تہذیبی قربت کے باعث اہم فیصلے بھی سکڑ کر ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے لگے ہیں۔ اب دنیا کی حالت یہ ہے کہ وقت (Time) اہم عنصر بن کر سامنے آنے لگا ہے۔ صبح کی خبر، شام کو تاریخ بن جاتی ہے، بروقت فیصلے انفرادی اور اجتماعی سطح پر تقدیریں بدلنے لگے اور بروقت اطلاعات نے انسانوں کے معاشی و سیاسی مسابقت کے جذبے کو ہوا دی ہے۔ غرض مواصلاتی نظام ایک سپر ہائی وے (Super High Way) ہے جس نے ترقی، مقابلے اور وقت کی اہمیت کو ہزار گنا زیادہ کر دیا ہے۔ گلوبل ولیج کی اصطلاح کو مثبت انداز سے دیکھنے والوں نے یوں لیا کہ جس طرح گاؤں میں سب لوگ ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں اور دکھ سکھ میں شامل و شریک رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی ذاتی زندگی میں دخیل ہوتے ہیں بالکل اسی طرح گلوبل ولیج یعنی تمام دنیا کے لوگ ایک دوسرے سے قربت رکھتے ہیں۔ اخبار، ٹی وی، کمپیوٹر اور ذرائع آمدورفت کی بدولت ''انفارمیشن سوسائٹی'' (Information Society) کا وجود ظہور پذیر ہوا۔ اس سوسائٹی کے تشکیلی مرکبات و عناصر نالج سوسائٹی (Knowledge Society) سے بالکل مختلف تھے۔

موجودہ ''عالمگیریت'' کی مخالفت کرنے والوں کے پاس سب سے اہم جواز یہی ہے۔ معاشرے کی مادی بنیادوں پر زور دے کر تجربی علم کی جگہ اس کے اطلاقی پہلو پر توجہ دی گئی۔ خالص علم کی بجائے معلومات اور تکنالوجی کی ترقی پر زور دیا جا رہا ہے۔ دنیا کے ممالک کے باہمی تعلقات کی بنیاد

''معیشت'' پر ٹکی ہوئی ہے۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ عالمی منڈی میں مقابلے کی فضا کو فروغ دیا جائے۔ بیرونی ممالک کا مال بلا روک ٹوک آنے دیا جائے تاکہ پسماندہ ممالک یا تیسری دنیا کے ممالک اپنی حالت بہتر بنانے پر مجبور ہو جائیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ممالک ترقی یافتہ ممالک کے مال سے بھر گئے اور ان کی مقامی انڈسٹری مقابلہ نہ کر سکی اور سارا فائدہ پھر ترقی یافتہ ممالک لے گئے۔ یہ استحصال کی ایک صورت ہے جو نہایت کارگر ثابت ہو رہی ہے۔ آج ہماری اشیاء صرف ایک معمولی بسکٹ، جیم جیلی، سے لے کر موٹر کار تک انہی کی دست نگر ہیں چنانچہ اس عالمگیریت کی معاشی بنیادوں کی مخالفت کرنے والوں کا موقف یہ ہے کہ اس نظام یا اصطلاح کو گلوبل ویلج اس لیے کہا گیا ہے کہ جاگیردارانہ ذہن شہری انداز میں نہیں سوچ سکتا۔ وہ اسے گلوبل سٹی نہیں بلکہ ویلج کہتا ہے تاکہ استعماراتی ذہن کو چھپا سکے اور منفی اثرات کو نرم ملائم کر کے پیش کر سکے۔

بہرحال عالمگیریت کی اس اصطلاح (Term) کو دونوں فکری Landscapes میں دیکھنا لازمی ہے۔ اس کی محض مخالفت بھی درست فیصلہ نہ ہوگا اور سوچے سمجھے بغیر حمایت بھی صحیح نہیں۔

''عالمگیریت'' کا تصور نیا، یا آج کی دنیا دین نہیں۔ دراصل یہ تصور سب سے پہلے افلاطون نے خیالی ریاست ''یوٹوپیا'' کے ذریعے متعارف کرایا۔ وہی خیالی ریاست ترقی کر کے تھامس میور کی کتاب ''یوٹوپیا'' تک آئی اور پھر کارل مارکس کی سوسائٹی تک جا پہنچتی ہے۔ فکری اعتبار سے یہ وہی تسلسل ہے۔ عالمی ریاست کا ایسا ہی خواب پہلی جنگ عظیم کے بعد لیگ آف نیشن (League of Nations) کی صورت اختیار کر گیا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ کے وجود کا باعث بنا لیکن یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ ''یوٹوپیا'' کا یہ تصور ہمیشہ ''اوپر'' سے آیا اس میں چھوٹی قومیں اور قومیت پستی ہی گئیں۔ یہ تصور ان لوگوں کے ذوق حکمرانی کو بڑھاتا گیا جن کی بدولت امپیریلزم اور کالونی ازم وجود میں آئے۔ اس طرح سیاسی، معاشرتی اور معاشی خبریں اور معلومات کی اہمیت دوگنا ہوگئی۔

آج دنیا ایک وحدت کی حامل ہوگئی ہے اتصالات عام ہیں، ابلاغ عام ہے، مصنوعی رکاوٹیں (Barriar) ہٹانے کی باتیں اور معاہدے ہوتے ہیں۔ ان رکاوٹوں میں کسٹم، ٹیکس ہی نہیں بلکہ حکومتیں، قومیں، قومیتیں، مقامی حکومتیں بھی شامل ہیں۔ یہ عالمگیریت کے راستے میں رکاوٹیں ہیں۔ چنانچہ "W.T.O" یعنی (World Trade Organization) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے مضمرات یہ تھے کہ مسابقت فضا بنائی جائے لیکن توانا اور کمزور کا مقابلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ گدھے اور گھوڑے کو ایک ہی دوڑ میں کیسے چھوڑا جا سکتا ہے اور اگر ایسا کیا جائے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ ایسی عدم مساوات کو ختم کیے بغیر چھوٹے ممالک کو تحفظ اور قوت نہیں مل سکتی۔ آزادی اور حقیقی آزادی کے بغیر آزادئ مسابقت کی بات خام خیالی ہے۔ یہ دراصل حریص، جابر اور اقتدار پسند حکومتوں کا بچھایا ہوا جال ہے۔ انٹرنیشنل ٹریڈ کے اس تصور نے ''خریدار'' کو بھی ختم کر دیا ہے۔ اب وہ خریدار نہیں رہا ''صارف'' بن گیا ہے۔ نئی معاشی

منڈی میں اشیائے ضرورت خریدی نہیں جاتیں بلکہ اشتہاری نظام (Network) اس بات کا فیصلہ کراتا ہے کہ کیا خریدنا ہے۔ اب خریدار کی ضرورت کی تعمیر کا کام ذرائع ابلاغ کے ذمہ ہے۔ اس عالمگیریت کو دراصل معاشی عالمگیریت کا نام دینا چاہیے۔

ایسی عالمگیریت کی مخالفت کرنے والے اور مزاحمتی رویے کو منظر پر لانے والے سوشل سائنسز (Social Sciences) کے لوگ ہیں۔ یہ لوگ مقامیت کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ یہ منظم سیاسی قوتیں ہیں جن میں شامل اہلِ فکر و نظر نئی دنیا کی تلاش میں ہیں جہاں کسی کی تہذیب، کلچر یا روایات داؤ پر نہ لگی ہوں اور جو صرف معاشی اقتدار اور ضرورت کو پیش نظر نہ رکھے۔

بہرحال اس سے بھی انکار نہیں کہ آج کے دَور میں دنیا کا کوئی ملک بھی اکیلا یا الگ نہیں رہ سکتا۔ سب ایک دوسرے سے کسی نہ کسی سطح پر متاثر ضرور ہوتے ہیں۔ عالمی سیاست، سماجی اور معاشی تقاضے اور بدلتے منظرنامے ہماری اقدار پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ امریکہ کا ۱۱ ستمبر کا واقعہ ہو، لندن میں ۷ جولائی کو ہونے والے دھماکے ہوں یا افریقہ، فلسطین یا کشمیر کی حالت زار ہو یہ سب عالمی منڈی کو بھی متاثر کرتے ہیں اور عالمی سیاست کو بھی۔ ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا سے پڑھے لکھے، ان پڑھ، چھوٹے بڑے سب ہی اثر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے تاثیر کی سطح میں فرق ہوتا ہے لیکن تاثیر سے انکار تو ممکن نہیں۔ ایسی صورتِ حال میں کسی فرد کا بھی دنیا سے بے خبر رہنے کا سوال ہی نہیں۔ اس طرح طے یہ پایا کہ دنیا کو عالمگیریت کا تصور دینے والے چند اہم عناصر ہیں۔ سب سے پہلے

۱۔ ذرائع ابلاغ
۲۔ بین الاقوامی تجارت/صنعت
۳۔ سیاست

ان محرکات کا تعلق ادب سے کیا ہے؟ ظاہر ہے ان محرکات کی پیداوار میں ادب کا حصہ نہیں کیونکہ یہ تجزیہ تو روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ عالمگیریت کا بنیادی محرک اور مقصد تجارتی مفادات تھے۔ اس کو پھیلانے میں ذرائع ابلاغ کا اہم حصہ ہے اور ذرائع ابلاغ کی وجہ سے ادیب جو معاشرے کا حساس فرد ہے، ان عالمی مسائل سے آگاہ ہوا جو بعد میں عالمی ادبی تحریکیں بن کر اُبھریں۔ اس طرح مختلف براعظموں کی تحریروں کی خوشبو ایک دوسرے تک پہنچی۔

فکر و نظر کی یہ ترسیل اور انتقال بھی صرف اس دور کی پیداوار نہیں۔ مغرب نے یونانیوں، رومنوں سے تہذیب، علوم و فنون حاصل کیے، مسلمانوں سے استفادہ کیا اسی طرح مشرق نے بھی ان سے بہت کچھ حاصل کیا۔ گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں صدی میں جب صلیبی جنگیں جاری تھیں اس وقت مسلمانوں کی تہذیب اپنے عروج پر تھی۔ دراصل فکری عالمگیریت کا آغاز اسی وقت ہوا۔ یہ انتقالِ علم کا زمانہ تھا۔ تمام علوم و فنون کو عربی میں ڈھالا جا رہا تھا۔ فارابی، ابنِ سینا، ابنِ رشد نے ایک علمی و فکری

نظریے کے ساتھ علوم کو فروغ دیا۔ اس پس منظر میں ایک عقیدہ کارفرما تھا، عالم بخیل نہیں ہوتا۔ وہ ہر اچھی چیز کو کھوئی ہوئی میراث جانتا ہے۔ یہ انفارمیشن سوسائٹی نہ تھی بلکہ نالج سوسائٹی کا قیام و دَور تھا۔ اس میں ''جوح الارض'' زمین کی بھوک شامل نہ تھی بلکہ ہر ملک ملکِ خدا سمجھا گیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مغربی درسگاہوں میں پڑھانے اور پڑھنے والے عربی کی اہمیت وحیثیت کو ماننے لگے تھے۔ تھامس بیکن اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا کہ ''کم بختو! اگر تم عربی نہیں پڑھو گے تو تمہارا کیا بنے گا؟'' بالکل ویسے ہی جیسے ہم آج انگریزی کے بارے میں یہی کچھ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

ادب میں زندگی کے تمام دھارے آکر سمٹ جاتے ہیں۔ یہ انسانوں کی انفرادی و اجتماعی صورتوں کو پیش کرنے کا وسیلہ بھی ہے اور انسانی ذہنی ارتقا کی دستاویزی شکل بھی۔ ادب میں عالمگیریت کا مفہوم بدل جاتا ہے اور یہ آفاقیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگرچہ آج عالمگیریت کا جو مفہوم لیا جاتا ہے وہ ادب کے ذریعے پیدا نہیں ہوئی لیکن اس کا ادب پر اثر ضرور پڑا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ادب میں عالمگیریت یعنی آفاقیت کا تصور ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ یہ آفاقیت، ابلاغِ عامہ، انفارمیشن اور ٹیکنالوجی کی آفاقیت نہیں، اتصال کی آفاقیت نہیں بلکہ جذبات اور فکری سطح پر مصروفِ کار آفاقیت ہے۔ عالمگیریت کے موجودہ تصور سے بہت پہلے شرق و غرب میں ادبیات کا تبادلہ ہوتا رہا، اس آفاقیت نے ٹیلی فون، ٹیلی وژن، انڈسٹری اور کمپیوٹر کا انتظار نہیں کیا بلکہ فکر و نظر کی بصیرت سے دنیا کے جن نابغہ روزگار نے استفادہ کیا اسے عام کیا۔

ارسطو کے نزدیک ادب کے ذریعے فنکار مظاہر فطرت اور مظاہر انسانی کی نقالی کرتا ہے، مظاہر انسانی میں انسانوں کے جذبات و احساسات، اعمال و افعال شامل ہیں اور جذبات و احساسات میں چند بنیادی جذبے ایسے ہیں جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہر انسان کا حصہ ہیں، یعنی نفرت، محبت اور حسد۔ ادب ان کی نمائندگی اور ترجمانی کرتے ہوئے پوری دنیا میں آفاقیت کی علامت بن جاتا ہے۔ پھر جس طرح حافظ، سعدی، رومی، اقبال صرف ہمارے نہیں رہتے اسی طرح ہومر، شیکسپیئر، ملٹن، گوئٹے وغیرہ سے ہمارا متاثر ہونا بھی فطری ہے اور اس سے بھی پہلے جب یونانی اور رومن تہذیب و ادب عروج پر تھا اُس سے بھی ساری دنیا نے استفادہ کیا ہے۔ آج بھی عمدہ ادب کی بنیادی تعریف دوامی قدریں اور دائمی حیثیت ہی ہے۔ یہ دائمی حیثیت صرف ہنگامی موضوعات سے حاصل نہیں ہوسکتی اور نہ اپنی مقامیت کی بنیاد پر ایسا ممکن ہے۔ اس آفاقی اور دائمی حیثیت کو حاصل کرنے کے لیے ادب میں اپنی صلاحیتیں آزمانے والوں کو اپنی احساساتی و فکری سطح کو وسیع کرنا پڑتا ہے۔ نالج کی بنیاد (Knowledge Base) پر بننے والے معاشرے اور دنیا میں ادب کی اہمیت حد درجہ تھی۔ آج معلوماتی دنیا میں عوامی رائے کو بدلنے کا واحد ذریعہ میڈیا ہے، اب ادب کو ایسا کرنے کے لیے اپنی آفاقیت کے تصور کو جدید علوم و فنون اور رجحانات کے ساتھ بھی ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ آج انسان کے دکھ درد اور جذبات کو سمجھنے کے لیے تیز رفتار دنیا

کے پل پل بدلتے حالات اور اس سے پیدا ہونے والے موضوعات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ادب فوری پن کا نتیجہ نہیں، فوری پن سے سطحی پن بھی پیدا ہوتا ہے اس لیے ہم دیکھتے ہیں ادب کی اصناف میں بھی اضافہ ہوا ہے جن میں ہنگامی موضوعات بھی ہیں لیکن ادبی چاشنی سے بھی انکار نہیں۔ انشائیہ، رپورتاژ، ادبی کالم نگاری، علمی مضامین، سفرنامے اور کئی شعری اصناف بدلتی دنیا کے بدلتے منظرنامے کی بدولت سامنے آئے ہیں۔ مغرب میں اُٹھنے والی ہر تحریک اور ہر خیال سے ہمارا ادب متاثر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، اسی طرح مشرق کے اہلِ علم و فن کا اعتراف بھی مغرب میں ہوا ہے۔ ریشنلزم، نیچرالزم، سرئیلزم، سمبولزم، ایکسپریشن اور وجودیت غرض ہر رجحان نے ادب میں اپنی جگہ اور شکل بنائی۔

ہر تحریک اور ہر رجحان کو ہنگامی اور سنجیدہ ادب میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق شرق و غرب کے ادیبوں شاعروں نے سمویا۔ گوئٹے کے ''پیام مغرب'' کے جواب میں اقبال جب ''پیام مشرق'' لکھتے ہیں تو یہ سمجھنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے کہ خود گوئٹے پر حافظ شیرازی کے اثرات کتنے گہرے ہیں۔ اس طرح ادب میں عالمگیریت یا آفاقیت کا تصور ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ ادب میں تازگی اور دائمی اقدار کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ خود اس کا تعلق زندگی سے کتنا گہرا ہے۔ زندگی جو خود ہر وقت تبدیلی کی زد پر ہے اس کے بارے میں کوئی اصول و قواعد حتمی نہیں ہو سکتے اس لیے ادب کے بارے میں بھی حتمی رائے ممکن نہیں اس کے باوجود ادب کی تشریح ہمارے تمام ناقدین نے اپنی اپنی سطح پر کی ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''یہ بحث بڑی پیچیدہ اور حوصلہ آزما ہے مگر یہ تو واضح ہے کہ صحت مند ادب کی پہچان یہ ہے کہ اس کی فکری اور شعوری روح تندرست ہو اور اس کی تندرستی کی علامت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کی پاکیزگی و طہارت اور اس کی تقویت و وسعت میں ممد ہو۔ ادب کا بہت بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ زندگی کی ترقی اور تازگی میں اعتقاد رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی ادب زندگی اور اس کی ترقی میں یقین نہیں رکھتا تو وہ گویا ایسی اقدار کا حامل ہے جن کا زندگی سے کچھ تعلق نہیں۔''
>
> (''اُردو ادب کی تحریکیں''، مشمولہ ''مباحث''، ص ۲۷۹)

ادب محض تخیل کی بے کار جولانی کا نام نہیں بلکہ اس کا صحیح عمل انسانی شخصیت کی تکمیل اور انسانی اجتماع کی خدمت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ادب شعوری یا لاشعوری طور پر اس معاشرت کی ترجمانی کرتا ہے جس سے وہ مربوط ہوتا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی وہ انسان کو ہی موضوع بناتا ہے، انسانوں کے دکھ درد، ابتلا و مصائب، خوشی، عیش و طرب کے قصے، اس کی نفرت، اس کی محبت، اس کے تعلقات، رشتے رابطے، انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کے اعمال اور ان کے ردِعمل، غرض ادب میں کیا نہیں۔ چنانچہ یہ بھی طے نہیں کہ وہ محض چند انسانوں، گروہوں، قوموں یا علاقوں کی نمائندگی کرے، اس ادب کی تابندگی اور

زندگی کا واحد باعث و جواز آفاقیت اور عالمگیریت ہی ہے۔ اس طرح کلاسیک وجود میں آتے ہیں جو زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہر دَور، تمام انسانوں اور تمام وقتوں کے لیے ہوتے ہیں۔ سیّد عابد علی عابد کلاسیک کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کلاسیک میں اپنے زمانے کی ثقافت اور تمدن کے تمام دھاروں، اُسلوبوں، وضعوں اور لہجوں کی مکمل ترجمانی ہوتی ہے، یعنی کلاسیک میں کم و بیش تمدن کے تمام عزائم و اعمال جلوہ گر نظر آتے ہیں۔'' (تنقیدی مضامین، ص ۲۵)

جب کسی ایک تمدن کے مجموعی عزائم اور اعمال تحریری شکل میں ادب کا حصہ بن جاتے ہیں تو پھر وہ انسانوں کی ذہنی دستاویز کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ انسانوں نے ذہنی ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے جن راستوں کی خاک چھانی ہے ان کی تحریری شکل ہی کلاسیکی ادب کہلائی جو آفاقیت کی امین ہے۔

آج عالمگیریت اور ادب کا رشتہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ گہرا ہو گیا ہے لیکن جہاں ادب کو ہنگامی موضوعات نے نعرہ بنایا وہاں معاشی عالمگیریت کے پرچار نے اس تصور کو بھی ٹھیس پہنچائی ہے۔ دنیا کے تمام معاشی وسائل کو اقتدار پسند حکومتیں اپنے تصرف میں رکھنا چاہتی ہیں اور اس کے لیے ان کی حکمت عملی نہایت عیاری اور سرعت کے ساتھ بدلتی ہے۔ حتیٰ کہ تیسری دنیا کے ممالک انہیں سمجھنے سے بھی قاصر رہ جاتے ہیں۔ آج کے جدید دَور میں اقدار تیزی سے بدل رہی ہیں، قوموں کی ترجیحات، خیر و شر کا تصور آرزوؤں اور خواہشات کی فطری اور غیر فطری تقسیم سب کچھ تبدیلی کی زد پر ہے۔ جو ممالک عالمگیریت کے تصور کے تحت دنیا کے بڑے وسائل پر تسلط چاہتے ہیں وہ Cloned Human تک بنانے میں مصروفِ عمل ہیں۔ ایک Cloned Human سے کون سی اخلاقی، سماجی اور تہذیبی اقدار کی توقع کی جا سکتی ہے اور ٹیکنالوجی کی پیداوار سے ادب (یعنی انسانی ذہنی ارتقا کی دستاویز) اور اس سے آفاقیت کی باتیں کتنی عجیب ہیں یہ ہم سب جانتے ہیں۔

نئے معاشرے کی ضرورت محض معلومات اور ٹیکنالوجی کی ترقی پر توجہ دینا نہیں، یہ سب جسمانی ضروریات ہیں۔ انسان دو چیزوں کا مرکب ہے روح اور جسم، کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنا فطرت کی خلاف ورزی ہوگی۔ جب بھی انسانوں نے فطرت کی خلاف ورزی کی ہے فطرت انہیں خود بھی سزا دیتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ روحانی ضروریات اور تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے اور یہ ضروریات مذہب، ادب اور دیگر فنون لطیفہ سے تکمیل پاتی ہیں۔ عالمگیریت کا تصور اسی وقت فائدہ مند ہو سکے گا جب یہ تمام انسانوں کی فلاح اور بھلائی کے لیے ہوگا نہ کہ مخصوص اقوام اپنے تسلط اور تصرف کے لیے اس تصور کا پرچار کریں۔ اجتماعی بھلائی اور فلاح کی عکاسی جس ادب میں ہوگی وہ آئندہ آنے والی نسلوں کو ذہنی ارتقا کا پتہ دیتا رہے گا۔ ادب کا ایک ایک لفظ ہمارے ذہن کو متحرک کرنے یا جذبے پر اثر انداز ہونے کی

صلاحیت کے سبب ہمیں ان انسانی جذبات و فکر کی خبر دیتا رہے گا جو بہ حیثیت انسان ہمارا امتیاز ہے اور عالمگیریت کے لیے ازبس ضروری ہے۔

کتابیات

۱۔ مضمون ''مستقبل کا معاشرہ اور ادب''، از قاضی افضال حسین، مشمولہ ''دریافت''، ستمبر ۲۰۰۴ء۔
۲۔ ''مباحث''، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء۔
۳۔ ''تنقیدی مضامین''، عابد علی عابد، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۶ء۔
۴۔ ''منتخب مضامین''، وارث علوی، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۰۲ء۔

☆☆☆

ایم خالد فیاض

مارک ٹوئین کی کہانی ''دعائے جنگ''

(ایک مطالعہ)

مارک ٹوئین کا شمار امریکا کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوا۔ ٹوئین بے شمار کتابوں کا مصنف ہے لیکن اپنی دو کتابوں ''دی ایڈونچرز آف ٹام سائر'' اور ''دی ایڈونچرز آف ہکلبری فِن'' اور ایک مضمون ''دی ڈیمڈ ہیومن ریس'' کے حوالے سے اُس کی شہرت پوری دنیا میں ہوئی۔ ''ٹام سائر'' کے بارے میں ہیمنگوے کا یہ کہنا کہ ''ٹام سائر سے امریکی نثری ادب نے جنم لیا ہے'' آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

اپنے مضمون ''دی ڈیمڈ آف ہیومن ریس'' میں ٹوئین، ڈارون کے اس نظریے کی کہ انسان، حیوان کی ترقی یافتہ شکل ہے، نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان، حیوان کی ارتقا یافتہ یا ترقی یافتہ شکل نہیں بلکہ وہ حیوان کی زوال پذیر یا پست ترین صورت ہے۔ ڈارون نے اپنی تھیوری حیاتیاتی بنیادوں پر تشکیل دی جب کہ ٹوئین نے اپنے نتائج سماجی اور معاشرتی مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر اخذ کیے۔ وہ کہتا ہے:

> ''میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ ہم کسی دُور دراز کے آباؤ اجداد سے تنزل اور خراب تر ہو کر بنے ہیں ___ کسی ایسے خورد بینی جوہر سے جو اتفاقیہ طور پر پانی کے ایک قطرے کے طاقت ور کناروں پر اپنی خوشی سے گھوم رہا تھا۔ حشرات در حشرات، حیوان در حیوان، رینگنے والے جانوروں سے ہوتے ہوئے، بے داغ معصومیت کی طویل شاہراہ پر چلتے چلتے، یہاں تک کہ ہم تنزل کی نچلی تہہ کو چھو چکے ہیں ___ جس کا نام انسان پکارا جاتا ہے۔ ہم سے نیچے ___ کچھ بھی تو نہیں۔''

ٹوئین نے اپنے تجربات میں انسانی لالچ، ہوس، ظلم، تشدد، بے رحمی اور جنگجوئیت جیسے عناصر کا مشاہدہ کیا اور مندرجہ بالا نتیجہ تک پہنچا۔ بعد میں اس نقطۂ نظر کی گونج ہمیں اکثر مفکروں اور ادیبوں کے ہاں سنائی دیتی ہے جن میں سگمنڈ فرائیڈ اور برٹرینڈ رسل کے نام پیش پیش ہیں۔

فرائیڈ بھی ایک جگہ انسان کو اُس کے ظلم کے حوالے سے دیگر حیوانات سے کمتر خیال کرتا ہے مگر وہ اس کے لیے قدیم انسان کا موازنہ کرتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ

> ''قدیم انسان نے اظہارِ نفرت پر کبھی کوئی پابندی عائد نہ کی تھی۔ وہ اپنے اردگرد پائی جانے والی دیگر مخلوقات کی نسبت سب سے زیادہ ظالم، بے حس اور بدطنیت

> تھا۔ قتل و غارت اُس کے لیے پسندیدہ ترین فعل تھا اور وہ انسان کشی میں بے حد دلچسپی رکھتا تھا۔ دیگر حیوانات ایک دوسرے کو ہلاک کرنے سے گریز کرتے تھے لیکن انسان کے لیے اپنی ہی نسل کو مار ڈالنا نہایت مرغوب تھا۔''

بعد کے انسان کے بارے میں فرائیڈ کا کہنا یہ ہے کہ تہذیب نے انسان کی جبلت کو کنٹرول کرنا شروع کیا۔ یہ تہذیب انسان کی جبلت کو دبانے میں تو کسی حد تک کامیاب ہوئی لیکن مکمل طور پر ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ لہٰذا اب تہذیب کا یہ دباؤ جہاں کہیں کمزور پڑتا ہے، انسان کی منہ زور جبلت پوری شدت سے اپنا اظہار کرتی ہے۔ اس قدر شدت کے ساتھ کہ بعض اوقات وہ وحشیانہ صورت اختیار کر لیتی ہے اسی حوالے سے فرائیڈ جنگ کو وقت کا ایسا حصہ قرار دیتا ہے جو جبلت پر عائد کردہ پابندیوں کو عارضی طور پر معطل کر دیتا ہے اور انسان کو اپنی وحشت کے کلّی اظہار کا موقع دے دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آئن سٹائن نے ''لیگ آف نیشنز'' اور ''انسٹی ٹیوٹ آف انٹلیکچوئل کوآپریشن'' کی تجویز پر ۱۹۳۲ء میں فرائیڈ کو خط لکھا جس میں بنیادی سوال یہ تھا کہ کیا انسان کو جنگ کی لعنت سے نجات دلانے کا کوئی طریقہ ہے؟ تو فرائیڈ نے مدلل بحث کے بعد یہ جواب دیا کہ انسانوں کے درمیان جنگ اور تشدد کے عناصر کو بالکل ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ وہ اسے انسان کی فطری جبلت قرار دیتا ہے۔

فرائیڈ انسان کے جنگجویانہ اور پُرتشدد عناصر کا سراغ اُس کے لاشعور کے اور نفسیات کے مطالعے سے لگاتا ہے مگر برٹرینڈ رسل یہی نتیجہ معاشرے کا سیاسی اور سماجی سطح پر مشاہدہ کرنے کے بعد اخذ کرتا ہے۔ وہ تحلیلِ نفسی کا ماہر نہیں اور نہ ہی وہ انسانی لاشعور کی دنیا کو اپنے مشاہدے کا محور بناتا ہے۔ وہ جب جنگ کے خلاف مہم پر نکلا تو سماج کے مشاہدے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ جنگی جنون میں صرف سیاسی قائدین ہی مبتلا نہیں ہوتے بلکہ عوام کی اکثریت بھی اس رو میں بہہ جاتی ہے اور جنگ و جدل سے ایک طرح کی لذت حاصل کرتی ہے۔

مارک ٹوئین ہو، فرائیڈ ہو، رسل ہو یا کوئی اور مفکر یا ادیب، انسان یا انسان کی انسانیت سے اُن کی برگشتگی کی وجہ، انسان میں پائے جانے والے بربریت، تشدد اور جنگجویانہ عناصر ہیں۔

مارک ٹوئین کی زیرِ مطالعہ کہانی ''دعائے جنگ'' بھی جنگ کے خلاف احتجاج کے طور پر لکھا گیا ایک طنزیہ ہے۔ جس میں ہمیں وہ یہ ہی دکھاتا ہے کہ جنگ کے دنوں میں عوام کی اکثریت جنگی جنون میں کس قدر مبتلا ہو جاتی ہے اور جب کوئی فرد اُن کے اس جنگی جنون کی نشان دہی کرتا ہے تو اُسے پاگل قرار دے کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مارک ٹوئین نے مذکورہ کہانی اپنے آخری دَور میں اُس وقت لکھی جب امریکا نے ۱۸۸۹ء سے لے کر ۱۹۰۲ء تک فلی پین میں فوج کشی کی۔ یہ کہانی ٹوئین کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی بلکہ اُسے اس کی اشاعت سے روک دیا گیا۔ یہ کہانی بعد میں پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے خلاف احتجاج کے طور پر

کہیں جا کر شائع ہوئی۔

یہاں اب ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہم ٹوئین کے جنگ اور انسان کے باہمی تعلق سے متعلق نظریات کو بھی دیکھتے چلیں تا کہ ہمیں اُس کی مذکورہ کہانی کا نقطۂ نظر سمجھنے میں کسی قسم کی کوئی دقت نہ ہو۔ ان نظریات کا اظہار اُس نے اپنے اُسی مضمون ''دی ڈیمڈ ہیومن ریس'' میں ہی کیا ہے جس کا ذکر ابتدا میں کیا گیا اور یہ کہانی انہی نظریات کا اعادہ کہی جا سکتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''صرف انسان ہی وہ جانور ہے جو اس ظالمانہ ترین ظلم میں ملوث ہوتا ہے جسے جنگ کہتے ہیں۔ وہی ایسا واحد جانور ہے جو اپنے بھائیوں کو اپنے ساتھ جمع کر کے پُرسکون انداز اور اطمینان کے ساتھ اپنی ہی نسل کو ختم کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ وہی واحد ایسا جانور ہے جو ذرا سی رقم یا تنخواہ کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔۔۔ اور اپنی ہی نسل کے اُن اجنبیوں کے قتل میں مدد دیتا ہے جنہوں نے اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہوتا اور جن کے ساتھ اُس کی کوئی (ذاتی) لڑائی نہیں ہوتی۔۔۔ انسان واحد محبِّ وطن ہے۔ وہ اپنے ملک میں، اپنے پرچم تلے اپنے آپ کو رکھ لیتا ہے اور دوسری قوموں کا مذاق اُڑاتا ہے اور دوسرے لوگوں کے ملکوں کے ٹکڑے چھیننے کے لیے بھاری اخراجات کر کے باوردی قاتلوں کی بھاری نفری تیار رکھتا ہے۔''

اب ہم مارک ٹوئین کی کہانی کی طرف آتے ہیں۔ کہانی میں جو منظر دکھایا گیا ہے وہ جنگ کے دنوں کا ہے جب ہر طرف جوش و خروش اور جذبہ حب الوطنی اپنے عروج پر ہے۔ ہر ہاتھ میں جھنڈا ہے۔ کہانی کے لیے جس مقام کا انتخاب کیا گیا ہے وہ گرجا گھر ہے، جہاں وہ سب رضا کار موجود ہیں جنہیں اگلے روز محاذ پر جانا ہے اور اُن کے ساتھ اُن کے عزیز اور پیارے بڑے مغرور اور شاداں بیٹھے ہیں اور اُن عزیزوں کی قسمت پر وہ لوگ رشک کر رہے ہیں جنہیں اس جنگ میں بھیجنے کے لیے ایسے بھائی اور بیٹے نصیب نہیں جو یا تو اپنے پرچم کے لیے فتح یاب ہو کر لوٹیں یا بلند رتبہ موت سے ہمکنار ہوں۔

اب گرجا گھر میں عبادت کا آغاز ہوتا ہے۔ عہد نامہ عتیق سے جنگ کے ایک باب کی تلاوت کی جاتی ہے۔ دعائے اول کے بعد انتہائی رقت انگیز اُسلوب میں دعائے طویل شروع ہوتی ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ اے ہمارے باپ ہمارے نوجوان سپاہیوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھ اور حب الوطنی کے اس فرض کی ادائی میں اُن کی اعانت کر، اس خوں ریز پیکار میں انہیں مضبوط ثابت قدم رکھ، غنیم کو کچلنے میں ہر طرح اُن کی مدد فرما، اُن کے پرچم اور ملک کو لازوال سربلندی اور شکوہ عطا کر۔

اسی دوران ایک عمر رسیدہ پراسرار اجنبی گرجا گھر میں داخل ہوتا ہے اور پادری کے برابر جا کھڑا ہوتا ہے اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میں باری تعالیٰ کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ خدا

تمہاری دعا قبول فرمائے گا لیکن اُس وقت جب میں اس دعا کے سارے مضمرات تمہیں سمجھا چکوں گا کیونکہ تم نے ابھی جو دعا مانگی وہ ایک دعا نہیں تھی بلکہ دو دعائیں تھیں۔ ایک وہ جو زبان سے ادا ہوئی اور دوسری وہ جو زبان سے ادا نہیں کی گئی۔ وہ انہیں کہتا ہے کہ یہ بات سوچو کہ جب تم اپنے لیے ایک برکت کی التجا کر رہے ہوتے ہو، خبردار! کہیں ایسا تو نہیں کہ ٹھیک اُسی وقت تم، قصد و ارادے کے بغیر، کسی ہمسائے کے لیے قہرِ الٰہی مانگتے ہو۔

اور پھر وہ انہیں دعا کا وہ حصہ سناتا ہے جو زبان سے ادا تو نہیں ہوا لیکن جسے خاموشی کے ساتھ بہت ولولے کے ساتھ دلوں سے ادا کیا گیا۔ وہ انہیں بتاتا ہے کہ تم لوگوں نے زبان سے نہ ادا کی گئی یہ دعا مانگی کہ اے ہمارے خداوند! ہماری مدد کرتا کہ ہم اپنے گولوں سے اُن کے سپاہیوں کے چیتھڑے اُڑا دیں۔ مدد کر ہماری کہ ہم اُن کے گھروں کو آگ کے طوفان میں نیست و نابود کر دیں۔ ہم اُن کے کھیتوں میں اُن کے مردہ محبِّ وطنوں کے زرد لاشے بچھا دیں اور کچھ ایسا کر کہ وہ اپنی روح میں کچلے ہوئے قبر کی پناہ کے لیے تجھ سے التجا کریں اور جواب میں تیرا انکار ہی سنیں۔

اور اس کے ساتھ وہ اجنبی اُن کو یہ بھی بتاتا ہے کہ تم نے یہ سب مانگتے ہوئے دل ہی دل میں یہ اقرار بھی کیا کہ ہم یہ سب اُس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر طلب کرتے ہیں کہ جو سرچشمہ ہے محبت کا، جو ہر حال میں اور ہمیشہ وفا کرنے والا دوست ہے، جو سبھی گھر جانے والوں کی اور عاجز و پشیماں دلوں کے ساتھ مدد چاہنے والوں کی پناہ گاہ ہے۔

یہ کہہ چکنے کے بعد وہ اجنبی اُن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ یہ ہے اصل دعا جو تم نے مانگی تھی اب بھی اگر تم یہی چاہتے ہو تو کہہ دو میں منتظر ہوں۔ لیکن مارک ٹوئین یہاں ہمیں یہ بتا کر کہانی ختم کر دیتا ہے کہ ''بعد میں لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ آدمی پاگل تھا، کیونکہ جو کچھ اُس نے کہا اُس کی کوئی تُک نہیں تھی۔''

مارک ٹوئین کی یہ کہانی جیسا پہلے بھی ذکر ہوا کہ اصل میں جنگی جنون میں مبتلا عوام پر ایک طنزیہ ہے لیکن ایسا طنزیہ جو ساتھ ہی ساتھ یہ اشارہ بھی کر دیتا ہے کہ اس جنون کے اسباب کیا ہیں۔

اصل میں جنگ کرنے والا ایک مخصوص حکومتی طبقہ ہوتا ہے۔ اُسی کے مفادات جنگ سے جڑے ہوتے ہیں۔ وہ ہی طبقہ جنگ کو فروغ دیتا ہے اور عوام کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دیتا ہے حالانکہ تمام سیاسی اور معاشی مفادات یہ حکومتی طبقہ اُٹھاتا ہے بلکہ انہی مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ جنگی عزائم کو بڑھاتا اور پھیلاتا ہے۔ اس حقیقت کی عکاسی مارک ٹوئین کے ہم وطن اور دنیائے ادب کے مایہ ناز ادیب ارنسٹ ہیمنگوے نے اپنے شہرہ آفاق ناول A Farewell to Arms میں اپنے دو کرداروں کے حوالے سے نہایت خوبی سے کی ہے۔ دونوں کردار آپس میں مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

پہلا کردار: ''ہر ملک پر ایک خاص طبقہ حکومت کرتا ہے۔ اس طبقے کی جہالت اور بے وقوفی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ انہیں کسی بات کی سمجھ آ ہی نہیں سکتی۔ ان ہی کی مہربانی سے اس لڑائی کا دم خم ہے۔''

دوسرا کردار: ''اور تم شاید یہ بات کہنا بھول گئے کہ وہ لوگ اس جنگ کے طفیل لاکھوں کماتے ہیں۔''

لہٰذا فرائیڈ کے نفسیاتی اور لاشعوری اسباب اپنی جگہ لیکن جنگ کے جو معروضی اسباب ہمارے سامنے آتے ہیں اُن میں سیاسی اور معاشی اسباب سرفہرست ہیں اور ان سے انکار ممکن نہیں۔ جنگ سراسر حکومتی طبقہ کے مفاد میں ہوتی ہے، عوام کے مفاد میں قطعاً نہیں ہوتی۔ جنگ کا سارا فائدہ حکومتی طبقہ اُٹھاتا ہے اور تمام نقصانات عوام کے حصے میں آتے ہیں لیکن چونکہ قربانی عوام ہی سے لی جانی ہوتی ہے اور عوام کے وسائل ہی کو جنگ کا ایندھن بنانا ہوتا ہے لہٰذا حکمران طبقہ عوام کو اس قربانی پر مائل کرنے کے لیے بلند اخلاقی مقاصد، مذہبی تحفظ، فرائض، ملکی مفادات اور قومی نصب العین جیسے نعروں کی آڑ میں اکساتا ہے۔ اس کے لیے وہ خطیبوں، پادریوں، ملاؤں کی حمایت حاصل کرتا ہے جو شہادت، جنت، مقدس موت، دائمی زندگی وغیرہ کے تصورات ساتھ جوڑ کر لوگوں میں موت کو زندگی پر فوقیت دینے کا رجحان پیدا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس اکساہٹ میں تخریب اور نفرت کے وہ جذبات بھی معاون ثابت ہوتے ہیں جو انسان میں کسی نہ کسی صورت میں اور شدت سے موجود ہوتے ہیں۔ آئن سٹائن نے بھی اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ جب اُس نے انسانوں کے اکسائے جانے کا سوال اُٹھایا کہ آخر انسانوں کو اتنی آسانی سے کیوں کر اکسایا جاسکتا ہے کہ وہ عقل و خرد کھو بیٹھیں اور اپنی زندگی تک کو داؤ پر لگانے سے گریز نہ کریں؟ تو اس کا جواب خود ہی دیتے ہوئے آئن سٹائن نے کہا کہ غالباً ہر انسان کے اندر تخریب اور نفرت کے شدید جذبات موجود ہوتے ہیں جو زمانہ امن میں حالت خوابیدگی میں رہتے ہیں اور صرف غیر معمولی حالات میں بیدار ہوتے ہیں لیکن ان کو ابھارنا اور بروئے کار لانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا یہ بہت جلد سرگرم عمل ہو کر اجتماعی پاگل پن کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

بہرحال انہی کھوکھلے مگر جذباتی نعروں، حکومتی اکساہٹ اور انسان کی فطری تخریبی قوتوں کا نتیجہ ہوتا ہے کہ عوام الناس جنگی جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس جنون میں مبتلا ہو کر جہاں وہ جنگ میں ایک دعا اپنی فتح و نصرت اور شاندار کامیابی کی کرتے ہیں وہاں ایک دعا بغیر شعوری ارادے کے دوسروں کی ناکامی، ذلت اور دردناک موت کی کرنے لگتے ہیں کیونکہ جنگ میں شریک اور مبتلا ہونے والے افراد کو اپنے طور پر اس بات کا یقین ہو چکا ہوتا ہے یا دوسرے لفظوں میں چاہے یوں کہہ لیں کہ یہ یقین دلا دیا گیا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دفاع، اپنے وقار کی خاطر برسرپیکار ہیں اور یہ کہ انہیں اس معاملے میں اپنے خدا کی حمایت اور تائید حاصل ہے اور جو شاید صرف انہی کا خدا ہے اور وہ گروہ یا قوم جو اُن سے برسرپیکار ہوتی ہے اُسے اس قدر نامعقول، ظالم اور بدمعاش سمجھا جاتا ہے کہ دنیا کو بدی سے محفوظ رکھنے کے لیے انہیں نیست و نابود کرنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

یہ کہانی اس حوالے سے اہم ہے کہ جنگ کے ان تمام پہلوؤں کا شعور ہم میں اُبھارتی ہے اور اپنے اس مقصد میں کہ پڑھنے والوں میں جنگ کے خلاف جذبات اور تعقلات پیدا کیے جائیں، بھی

کامیاب قرار دی جاسکتی ہے۔

اس کہانی کے بنیادی کردار دو ہیں۔ ایک وہ پراسرار عمر رسیدہ اجنبی جو عوام کو اُن کی زبان سے ادا نہ کی گئی جنگ کی دعا کے مضمرات سے انہیں آگاہ کرتا ہے اور دوسرا کردار عوام کا ہے جو اپنی دعا کے مضمرات اُس اجنبی کے منہ سے سن کر اُس کا مذاق اُڑا دیتی ہے اور اُسے پاگل قرار دے کر رد کر دیتی ہے۔ یوں بظاہر یہ لگتا ہے کہ جس صورت حال سے کہانی کا آغاز ہوا تھا وہ ہی صورت حال کہانی کے اختتام پر بھی قائم ہے لیکن یہ صورتِ حال کہانی کے کینوس پر موجود ہے۔ قاری کے ذہنی کینوس پر کچھ اور نقوش مرتب ہو چکے ہیں۔ بے شک وہ اجنبی کہانی میں موجود عوام پر اپنا اثر چھوڑنے میں ناکام نظر آرہا ہے لیکن اُس نے کہانی سے باہر قاری پر اپنا اثر ضرور مرتب کیا ہے۔ افسانے کے بنیادی تاثر کو اُبھارنے کے لیے یہ ضروری بھی تھا کہ اجنبی کو وہاں ناکام دکھایا جائے کیونکہ کہانی کار کا اصل مقصد عوام کی ناعاقبت اندیشی کو طنزیہ پیرائے میں بیان کرنا تھا۔ اس لیے کہانی کا یہ انجام ضروری تھا کہ عوام اُس، انسانیت کے خیر خواہ اجنبی کا مذاق اُڑائے اور اُسے رَد کر دے۔

لیکن یہاں ایک بات توجہ طلب ہے یہ بالکل درست ہے کہ ٹوئین نے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنے میں نہایت خوش اُسلوبی اور فنی چابکدستی سے کام لیا ہے اور کامیاب رہا ہے لیکن بہرحال اُس نے عوام کا جو نقشہ کھینچا ہے اُس کا تاثر یا امیج قاری کے ذہن میں کافی ادھورا اور مایوس کن بنتا ہے۔ یہاں تک یہ بات درست ہے کہ عوام کی اکثریت جنگ کے ابتدائی دنوں میں جنون اور پرتشدد جذبات میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ وہ حکومتی ہتھکنڈوں کے آگے بے وقوف، احمق اور جذباتی ثابت ہوتی ہے لیکن دو باتیں غور کرنے کے لائق ہیں۔ ایک تو یہ، کہ یہ کیفیت جنگ کے ابتدائی دنوں میں زیادہ ہوتی ہے اور دوسرا یہ، کہ اس کیفیت کا شکار عوام کی اکثریت تو ہوتی ہے لیکن کل عوام نہیں۔ پوری کی پوری عوام بالکل ایسا ہی ردِعمل ظاہر نہیں کرتی۔ عوام کا ایک اقلیتی مگر قابل قدر حصہ جو مختلف عوامل کے علل و اسباب پر معروضی نگاہ رکھتا ہے، وہ جنگ، بربریت اور توسیع پسندانہ اقدامات کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور جنگ بندی کے اقدام کا، یہ عوامی حصہ بالخصوص اور باقی حصہ جو ابتدا میں جنگ کی حمایت میں نعرے لگاتا تھا بالعموم، بڑی حد تک گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کرتا ہے کیونکہ عوام کی اکثریت بلاشبہ جنگ کی ابتدا میں حکومتی پراپیگنڈا کی صورت میں جنگی جنون میں مبتلا ہو جاتی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جنگ کی طوالت اور بربریت اُس کو ہراساں بھی کر دیتی ہے۔ اس بات کا تجربہ برٹرینڈ رسل کو بھی ہوا تھا جب پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کا اعلان ہوا تو لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور والہانہ رقص کرنے لگے اور یہیں اُس نے ایک دوشیزہ کو ایک نوجوان کا بوسہ لیتے بھی دیکھا لیکن جس طرح رسل اس واقعے سے انسان کے بارے میں کوئی واضح مثبت رائے قائم نہ کر سکا، مارک ٹوئین بھی عوام کو ایک کُل کی صورت میں دیکھنے اور دکھانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اُس نے جو عوام کا کردار ڈھالا ہے، اُس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کردار یک رُخا اور

ادھورا ہے۔ٹوئین عوام کے صرف ایک حصے کی ایک مخصوص لمحے میں نمائندگی کر سکا۔اس کے باوجود کہ ٹوئین نے عوام کی اکثریت کی مخصوص زمان میں بھرپور عکاسی کی اور سیاست اور مذہب کے ہاتھوں بنی کٹھ پتلی عوام پر یہ موثر طنزیہ پیش کیا، یہ حقیقت اپنی جگہ موجود رہتی ہے کہ اس کہانی کی بنیاد ٹوئین نے عوام کے گہرے تجربے اور مشاہدے و تجزیے سے زیادہ نوع انسانی سے متعلق اپنے اُس منفی نقطۂ نظر پر رکھی ہے، جس کو وہ اس سے پہلے تشکیل دے چکا تھا اور جس کا تفصیلی ذکر مضمون کے آغاز میں کیا گیا۔

اب جس طرح سے اس افسانے میں مارک ٹوئین کا اجنبی کردار عوام سے مخاطب ہو کر دعا کے بارے میں اُس کی حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے کہ

''خداوند کا اور تمہارا خادم اپنی دعا کر چکا ہے۔ پر کیا یہ (پادری کی طرف اشارہ ہے) دم بھر کو رُکا ہے، کیا غور کیا ہے اس نے؟ اور سوچو کیا یہ ایک دعا تھی؟ نہیں، یہ دو دعائیں تھیں۔ایک وہ جو زبان سے ادا کی گئی دوسری وہ جو نہیں کی گئی۔''

اسی طرح سے ہم بھی یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا عوام اور نوع انسانی کے بارے میں ٹوئین نے غور کیا ہے؟ اور سوچا ہے کہ کیا اُس نے جو حقیقت بیان کی وہی حقیقت ہے، نہیں، بلکہ یہ حقیقت کا ایک رُخ تھا۔اگرچہ بہت واضح اور ظاہر جو قلم سے بیان کیا گیا لیکن اس حقیقت کا ایک دوسرا رُخ بھی تھا جو بیان نہیں کیا گیا۔یعنی عوام کا ایک طبقہ جنگ اور جنگی جنون کو التفات کی نگاہوں سے نہیں دیکھ رہا ہوتا اور یہ طبقہ ہے خود مارک ٹوئین، فرائیڈ، برٹرینڈ رسل، آئن سٹائن، سارتر، کامیو، ایرک فرام، مارکس، ارنسٹ ہیمنگوے، ٹالسٹائی، فیض اور بے شمار ایسے انسان دوست اور زندگی سے محبت کرنے والے ادیبوں، شاعروں، مفکروں اور سائنس دانوں کا، جو دنیا کے مختلف خطوں میں موجود ہیں اور یہی طبقہ مستقبل کی نسل انسانی کے بہتر مقدر کا ضامن ہے۔

لہٰذا فکر و اندیشے اپنی جگہ مگر آنے والی نسلوں کے بارے میں قطعی مایوسی و ناامیدی کی مطلق ضرورت نہیں اور یہی وہ نقطۂ نظر ہے جسے نہ تو مارک ٹوئین اپنا سکا اور نہ اُس کی یہ کہانی بیان کر سکی لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اپنی حدود کے اندر اور مخصوص نقطۂ نظر کے زیر اثر لکھی گئی ٹوئین کی یہ کہانی بلاشبہ نہایت اہم ہے اور جنگ کے خلاف لکھے گئے احتجاجی ادب میں ایک معتبر مقام کی حامل ہے جو دل و دماغ کو فکر و شعور عطا کرتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد امین

تین کتابیں تین دوست

کالم نگاری صحافت کی ضرورت ہے۔اخبارات میں اضافے کے ساتھ ساتھ کالم نگاروں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔بہت سے ادیبوں نے اسے بطور پیشہ اپنایا۔بعض نے اسے وسیلہ اظہار بنایا۔اور بعض نے صرف اپنے شوق و ذوق کی تسکین کے لئے کالم لکھے۔کالم بہت سی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ مضمون، انشائیہ، مزاحیہ، افسانہ، رپورٹ، تبصرہ، تاثر وغیرہ ان مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے ادیبوں کے لئے کالم لکھنا بہت آسان ہے۔اس آسانی کے باوجود اہم مسئلہ قارئین کے دل میں جگہ پانا ہے، اگر آپ کا کالم پڑھا نہیں جاتا یا موضوع بحث نہیں بنتا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔اس کے لئے موضوعات کے ساتھ ساتھ کالم نگار کا اسلوب ہے جو قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔اس لئے کالم نگاروں کو موضوع کے ساتھ ساتھ اسلوب پر بھی توجہ دینی چاہیے۔اور جو کالم نگار یہ اسلوب تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گیا، وہ کامیاب کالم نگار ہے۔منو بھائی اور عطاء الحق قاسمی کا اسلوب ہی ہے جو ان کی وجہِ شہرت ہے۔ملتان میں بھی کچھ نوجوانوں نے کالم نگاری پر توجہ دی اور اب ان کا شمار ممتاز کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔اس فہرست میں بہت سے لوگ شامل ہیں۔لیکن اس مضمون میں صرف تین کا تذکرہ مقصود ہے۔

اظہر سلیم مجوکہ تنقیدی مضامین لکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ انہوں نے کالم نگاری کو بھی اپنایا۔وہ ''ہے خبر گرم'' کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں۔اور اس عنوان سے انہوں نے ایک سو بائیس کالموں کا مجموعہ شائع کیا ہے ان کالموں میں وہ تمام موضوعات موجود ہیں جو ہمارے معاشرے میں بکھرے پڑے ہیں۔ میڈیکل انٹری ٹیسٹ سے لے کر خودکشی، قتل و غارت اور ناانصافی کے تمام مسائل کا ذکر موجود ہے۔

کالم مختصر ہوتا ہے۔اختصار اس بنیادی ضرورت اور خصوصیت ہے۔اظہر سلیم مجوکہ کے اسلوب میں پرکشش عنوان کی تلاش کا عنصر شامل ہے۔مثلاً تتلی کے تعاقب میں، کوئی پھول سا بچہ، جب موت زندگی سے دلکش نظر آتی ہے، میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں، خبر کی آنچ میں جل کر بے خبر رہنا، ہر ایک جسم شکستہ ہر ایک چہرہ سوال، چولستان کی پیاس، اس طرح لفظوں کے ایسے جوڑے بنانا جس سے طنز و مزاح پیدا ہو۔مثلاً مردم شماری اور مردم شناسی، ریفریشر کورس یا پریشر کورس۔یہ عنوانات اپنے اندر اتنی کشش رکھتے ہیں کہ قاری کی توجہ کا مرکز بن سکیں اور قاری کو کالم پڑھنے کی تحریک دے سکیں۔

کالموں میں ہر محل خوبصورت شعروں کا انتخاب و استعمال بھی ان کے ذوق مطالعہ کی دلیل ہے پرانی تحریروں میں شعروں کے اس استعمال کو بڑی خوبی سے سمجھا جاتا تھا۔ابوالکلام آزاد کی نثر کی ایک خوبی ان ہی شعروں کا استعمال ہے اور بہت سے اشعار ان کے اس استعمال کی وجہ سے زندہ ہیں۔

اظہر سلیم مجوکہ نے بھی خوبصورت اشعار سے اپنے کالموں کو سجایا ہے۔ بلکہ انہوں نے مصرعوں کو عنوان بھی بنایا ہے۔ اسلوب میں ادبی چاشنی موجود ہے۔ جملے اثر انگیز و فکر انگیز ہیں۔ مثلاً کہانیوں اور جگنوؤں کے موسموں میں رہنے کی بجائے ان بچوں کا بچپن روٹی کے چند ٹکڑوں اور تن کے چند کپڑوں کے حصول کے لئے سرد موسموں اور ٹھٹھرتی شاموں میں گزرے گا (اکیسویں صدی کا پہلا کالم) یقیناً بہت سے شہروں کا یہ المیہ ہے کہ وہاں بے چہرگی بستی ہے۔ (میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں) پردیس جانے والے خود کس اذیت میں مبتلا رہتے ہیں، اور ان کے ہجر اور جدائی میں دیس میں رہنے والوں کے دلوں پر کیا بیتتی ہے، اور ہجر کی پہلی رتیں کتنے آنکھوں کے خواب مرجھا دیتی ہیں (تم جاؤ جو پردیس تو یہ دھیان میں رکھنا)۔

اس طرح کے بہت سے جملے اور فقرے اس کے کالموں میں تلاش کئے جاسکتے ہیں جو اس کے کالم نگاری کے اسلوب میں کشش اور جاذبیت پیدا کرتے ہیں۔ جو کالم نگاری کی بنیادی شرط ہے۔ اظہر سلیم مجوکہ اس مجموعے میں ایک کامیاب کالم نگار کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔

دوسرے کالم نگار شاکر حسین شاکر ہیں۔ وہ ''کہتا ہوں سچ'' کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے کالموں کا مجموعہ ''پورا حلوہ آدھی پوری'' کے نام سے چھایا ہے۔ اس میں تریسٹھ کالم شامل ہیں۔ یہ کتاب رضی الدین رضی کے نام انتساب ہے۔ مجھے ان دونوں کی دوستی پر شک آتا ہے۔ بہت ساری مشترک سرگرمیوں کے باوجود ان میں پروفیشنل جیلسی نہیں پائی جاتی جسے معاصرانہ چشمک بھی کہتے ہیں۔

شاکر حسین شاکر مضمون نگار، تجزیہ نگار، مورخ اور شاعر بھی ہیں ان سب حیثیتوں میں اس کی کتابیں شائع ہوکر سامنے آچکی ہیں اور اس نے اپنی ہر حیثیت کی داد پائی ہے۔ شاکر کے موضوعات ادبی، سیاسی اور ثقافتی ہیں۔ لیکن جو خصوصیت اسے اپنے دیگر دوستوں اور کالم نگاروں سے الگ کرتی ہے وہ اس کا اسلوب ہے۔ جس پر مزاح اور شگفتگی غالب ہے شاکر حسین شاکر کے یہاں طنز کہیں بھی نہیں ملتی۔ اس کے عنوانات بھی شگفتہ ہوتے ہیں۔ مثلاً جانوروں کے لئے خودکشی کا نسخہ، آشوب چشم اور طوطا چشم، قربانی کے بکروں کا مختصر تعارف، شادی ٹیکس میں کمی اور میئر کی دوسری شادی وغیرہ۔ شگفتگی اس کے ہر جملے سے ٹپکتی ہے جس طرح شاکر کا چہرہ مسکراتا ہے۔ اسی طرح اس کا کالم بھی مسکراتا ہے۔

چند مثالیں دیکھئے

عوامی بکرا۔ اس طرح بکروں میں گوشت کم ہوتا ہے بس جسم پر کھال ہی کھال ہوتی ہے۔۔۔ اس کو جو کچھ ملے خاموشی سے کھالیتا ہے، اکثر گھاس پھوس کے بل دیکھ کر اس کی بھوک اڑ جاتی ہے، یہ ٹکڑا ظرافت کی دوتہی معنویت کا بہترین نمونہ ہے، غور کیجئے۔ لطف اٹھائیے، اور سوچئے کیا اس میں ہمیں اپنا چہرہ نظر نہیں آتا۔ یہ عکس دکھانا ہی کالم نگار کا کمال ہے۔

''مارکیٹ میں عوامی بکرے آج کل کھانسی اور بخار کی وجہ سے چپ چپ رہتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے منہ میں زبان نہیں۔'' یہ جملے غور طلب ہیں، اور فکر انگیز ہیں۔

جمائما کی جمائی۔ آج کل ہمارے ملک میں ہر طرف علیحدگی کی تحریکیں چل رہی ہیں۔۔۔ اس تحریک کو دیکھ کر تحریک انصاف کے صدر عمران خان نے سوچا کہ وہ علیحدگی کے سیزن میں پیچھے کیوں ہیں۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنی اہلیہ جمائماں خان سے علیحدگی کا اعلان کر ڈالا۔ انہوں نے نہ صرف اپنی زوجہ سے جان چھڑائی بلکہ بچوں سے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔

پچھلے انتخابات میں عمران خان کا لوگو یہ تھا ''زنجیریں توڑیں گے''۔ وہ عوام کو غلامی سے نجات تو نہ دلا سکے۔ لیکن انہوں نے اپنی بیوی کو شادی کی زنجیروں سے آزاد کر دیا۔''

رانی مکرجی۔ ''جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ ان کا اصلی نام رانی ہے، لیکن ان کو بار بار مکر جانے کی عادت ہے، اس لئے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ مکر جی لگا رکھا ہے۔ سال میں کئی بار رانی اپنا راجہ تبدیل کرتی ہے، جس وجہ سے بہت سے ووٹر یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ کبھی نہ کبھی رانی ان سے شادی کرے گی۔''

مولانا رومانی۔ ''مولانا رومانی کا اصل نام کیا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں۔ چونکہ ان کو بار بار رومان کرنے کی عادت ہے۔ اس لیے اپنے نام کے ساتھ رومانی لکھتے ہیں۔ گلی میں ہر آتی جاتی خاتون پر عاشق ہوجاتے ہیں ان خواتین کے لیے بے وزن رومانوی اشعار کہتے ہیں۔ ان کی وجہ شہرت بھی بے وزن اشعار ہیں۔''

اس طرح کے بہت سے ٹکڑے اور جملے جمع کئے جاسکتے ہیں۔ ان کا شگفتہ انداز تحریر دلچسپ اور دل پذیر ہے۔ وہ ان کی ضمیر کو ہنسی ہنسی میں گدگداتے ہیں کہ مسکرایئے اور دیکھئے کہ اس کے پسِ منظر میں کیا ہے۔ شاکر کی شگفتہ تحریریں، غصہ، جھلاہٹ اور احتجاج سے بالکل پاک ہوتی ہیں۔ وہ طنز و تضحیک سے بھی گریزاں ہے۔ اس کی یہ شگفتگی ہی قاری کو متاثر کرتی ہے۔

رضی الدین رضی شاعر ہے، صحافی ہے، تنقید لکھتا ہے۔ اور کالم بھی لکھتا ہے۔ اس نے مختلف ناموں سے ادبی کالم لکھے۔ آج کل وہ ''ڈرتے ڈرتے'' کے عنوان سے کالم لکھتا ہے۔ نہ جانے اس نے یہ عنوان کیوں چنا۔ حالانکہ وہ کسی سے نہیں ڈرتا اور اس کا اظہار بے باکانہ ہوتا ہے۔ رضی نے اپنے ادبی مضامین اور کالموں کا مجموعہ ''آدھا سچ'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اکتیس مضامین کے اس مجموعے میں فہرست کی جگہ شخصیات کی تصویریں چھاپی گئی ہیں۔ اور تصویر کے اوپر صفحہ نمبر درج ہے۔ یہ بالکل نئی بات ہے، پہلے کہیں نظر نہیں آتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رضی کا ذہن اختراعی ہے، وہ نئی بات سوچتا ہی نہیں، بلکہ اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔

یہ مضامین اور کالم تقریبات میں پڑھے گئے، اخبارات میں چھپے اور اب کتابی صورت میں مطالعے کے لیے یکجا کئے گئے ہیں۔ بعض مضامین خاکہ نگاری کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ یہ تنقید کا تخلیقی روپ ہے۔ رضی نے تخلیق کو شخصیت کے ساتھ ملا کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں شخصیت غالب ہے اور

کہیں تخلیق غالب نظر آتی ہے۔ رضی کا انداز تحریر شگفتہ ہے لیکن بعض جملے کاٹ دار ہوتے ہیں اور بعض فقروں سے طنز جھلکتا ہے جن مضامین میں تخلیقات کا محاکمہ ہے وہ سنجیدہ ہیں مثلاً مستنصر حسین تارڑ کے ناول راکھ کے بارے میں سنجیدہ مضمون ہے۔ اسی طرح راقم الحروف کی کتاب ''خزان کا چاند'' کے بارے میں بھی اظہار خیال سنجیدہ ہے۔ میری نظر میں یہ مضامین ظرافت اور متانت کا امتزاج ہیں۔ رضی ظرافت کے محل کو جانتا ہے اور متانت کے موقع کو پہچانتا ہے۔ وہ دونوں کو ملانا اور جدا کرنا بھی جانتا ہے۔ یہ اس کے زیرک اور ذہین ہونے کی دلیل ہے۔

آدھا سچ ایک فلسفیانہ تصور ہے کہ مکمل سچائی انسان کی دسترس میں نہیں اور اگر ہو بھی تو اس کا اظہار ممکن نہیں۔ انسان کی رسائی آدھے سچ تک بھی ہو جائے تو بہت ہے۔ یہ مضامین اور کالم اسی سوچ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اِس کے انداز تحریر کے ان تین پہلوؤں کی مثالیں دیکھیں۔

میرا ہمزاد قمر رضا شہزاد: ایک دو بزرگ شاعروں نے ایک دفعہ ہمیں بڑے پتے کی بات بتائی تھی۔ ہم نے آج تک پلے کے ساتھ باندھ رکھی ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر کسی شاعر کی تعریف کرنی ہو تو تقریب میں مضمون پڑھنے کی بجائے فی البدیہہ گفتگو کیا کرو۔ لکھا ہوا سند بن جاتا ہے۔ فی البدیہہ گفتگو کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے کسی وقت بھی مکرا جا سکتا ہے۔

راکھ: ازلی اور اصلی دشمنوں کی کہانی، راکھ کو تارڑ کے پہلے ناول بہاؤ کا دوسرا حصہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ بہاؤ دریائے گھاگرا کے کنارے دم توڑتی تہذیب کی داستان ہے تو راکھ دریائے راوی کے کنارے آباد شہر کی داستان ہے۔ بہاؤ میں سرسوتی خشک ہوتا ہے تو راکھ میں راوی کا پانی کم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

اپنے آپ پر ہنسنا بڑی دلیری اور جرأت کی بات ہے۔ رضی نے اپنے بارے میں بھی لکھا ہے جو اس کتاب کا آخری مضمون ہے آہ۔ رضی الدین رضی۔ مشاعرے کے بعد پیسے بھی وہ گن کر وصول کرتے تھے۔ اسی روز بھی انہوں نے سو روپے کا ایک نوٹ گن کر جیب میں ڈالا۔ ایک شاعر نے انہیں کہا بھی کہ یہ ایک ہی نوٹ ہے اِسے کیوں گن رہے ہیں اس پر مرحوم نے یہ کہہ کر اسے لاجواب کر دیا کہ رقم تھوڑی ہو یا زیادہ گن کر ہی وصول کرنی چاہیے۔

رضی کو اظہار پر جو گرفت حاصل ہے۔ وہ اس کی ریاضت اور مشاقی کا حاصل ہے۔ میں رضی کی ذہانت، محنت اور صلاحیت سے بہت ہی پرامید ہوں۔

ان تینوں لکھاریوں میں بہت سی اقدار مشترک ہیں۔ اس لیے میں نے انہیں ایک ہی مضمون میں یکجا کیا ہے۔ وہ تینوں آپس میں دوست ہیں اور میرے بھی دوست ہیں، ہم عمر ہیں، ہم عصر ہیں، تینوں گورنمنٹ کالج سول لائنز سے پڑھے۔ تینوں کالم نگار اور مضمون نگار ہیں۔ کچھ اضافی خوبیاں بھی ہیں۔ ہر ایک کا انداز اور سلوب الگ اور منفرد ہے کہ یہاں پر پھول کا رنگ اور خوشبو جدا جدا ہے۔

☆☆☆

اخلاق انصاری/ (سندھی سے ترجمہ) ننگر چنا

خزاں رسیدہ پھول

راستے
ہاتھ ریکھاؤں کی طرح
بے معنی ہو گئے۔

آج اسی طرح میرے پاس معنی، بے معنی ہو گئے۔ ٹوٹ گیا ہوں، بکھر گیا ہوں۔ بدحواس اور گم ہو گیا ہوں۔ اب اُس کی یادوں کو کیا معنی دوں؟

مجھے یاد ہے، میں جب اُس کے پاس ہاسٹل جایا کرتا تھا تو بوگن ویلیا کے سرخ پھولوں کی ڈالی اسے بھینٹ کیا کرتا تھا۔ وہ جب ساون کے موسم میں سفید لباس زیب تن کیے شام کے لمبے سایوں تلے ٹہلا کرتی تو ہوا بھی اُس کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی تھی۔ اُس کے قہقہے بکریوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی طرح بجا کرتے تھے جو میرے دل کے صحرائے تھر میں خوشیوں کے مور رقصاں کر دیتے تھے۔

ہم اکثر ہاسٹل سے چل کر تراہا کراس کر کے پیپل کے نیچے جا بیٹھا کرتے تھے۔ دور ہاسٹلز کی روشنیوں کی دیوالی اور اُس کے من کی ترنگ شاید بہشت کو بھی اور زیادہ معنی بخش دے۔ جب چاند درختوں کے اوپر آ کاس ندی میں اپنا بادبان کھولتا تو یونیورسٹی کے لڑکے سوئمنگ پول کی روشنیاں بجھا کر نہاتے، چیختے، قہقہے لگاتے تھے۔ آج وہ سب کچھ چاند کے ساتھ بے معنی ہے۔

فزیولوجی میں پڑھتے ہوئے بھی ہمارے پسند کے موضوعات پتھر کے دور سے لے کر کھیلوں تک ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے بالوں کو سیمنٹ کے بنچ کے پیچھے چھوڑ کر ایزی چیئر کے سٹائل میں لیٹی ہوئی تھی، میں نے کہا:

''تم نے اپنی آنکھیں دیکھی ہیں؟''

''ہاں''۔

''بہت خوبصورت ہیں۔''

''مجھے پتہ ہے۔۔۔ مچی ہیں۔۔۔ بہرحال مجھے اپنی ناک اچھی لگتی ہے لیکن مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا ہے کہ عورتوں میں نتھ کا رواج کیوں پڑا۔۔۔ شاید اس لیے کہ مرد اس میں نکیل ڈال سکے؟''

میں نے کہا، ''نہیں، ایسا نہیں ہے۔''

''تو پھر کس لیے ہے؟''

''اس لیے کہ ناک، نکیل کے لیے نہیں بلکہ لونگ کے لیے۔۔۔ جو مرد ناک میں ڈال کر

عورت کو اپنا بنا لیتا ہے۔''

میری بات کاٹتے ہوئے اُس نے کہا، ''اپنا!''

اور اتنا ہنسی، اتنا ہنسی کہ میں زیادہ بول ہی نہ سکا۔

''اپنا'' لفظ کو اس نے کون سے معنی دیے، میں سمجھ نہ سکا۔

اِسی طرح اس کے برتھ ڈے پر میں نے ڈائری میں سورج مکھی کا آدھا پھول بنا کر گفٹ کیا۔

''آدھا پھول کیوں؟''

''یونانی دیو مالا میں ہے کہ عورت آدھی ہے۔۔۔ اس کا بقیہ حصہ مرد ہے۔۔۔ جب دونوں آپس میں ملتے ہیں تو مکمل ہو جاتے ہیں۔۔۔ ہم جب مکمل ہوئے تو اس پھول کو بھی مکمل بنائیں گے۔''

''مکمل ہونا کیا ہے؟ زندگی مکمل ہے؟'' اس نے کہا، ''سب کچھ نامکمل ہے۔۔۔ مجھے بتاؤ کون سی چیز مکمل ہے؟ اور اس میں یقین اور بے یقینی کا عنصر کتنا ہے۔۔۔؟''

میں خاموش رہا۔

اُس نے کہا، ''ہاں۔ سب کچھ غیر یقینی ہے۔۔۔ اگر غیر یقینی ہے تو پھر خواہ مخواہ تجربہ کیوں کیا جائے۔''

''اِس لیے کہ تجربہ ہی سچ ہے۔''

''کتنا سچ ہے؟''

''ایک لمحے کا۔۔۔''

''اور ایک لمحے کے سچ کے لیے پوری زندگی درد کیوں اُٹھائیں۔۔۔؟''

''یہ بات نہیں ہے۔۔۔ درد ہی تو سچ ہے۔۔۔''

وہ خاموش رہی۔

اور ہم دونوں نے اپنے آپ کو پڑھائی کے حوالے کر دیا۔

آخری سال امتحان کی تیاری کی چھٹیوں میں ہم دونوں ہاسٹل چھوڑ کر اپنے گھروں میں آ رہے۔ اس دوران میں، میں اس کے گھر جاتا، دونوں مل کر امتحان کی تیاری کرتے۔ سرخ پھولوں کی ڈالی میز پر پڑی رہتی۔ پڑھنا کم اور بولنا، باتیں کرنا زیادہ ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ وہ کافی دیر تک خاموش رہی، اس کی خاموشی میں غصہ تھا، اُس نے غصے میں خاموشی توڑتے ہوئے کہا:

''ہٹلر نے سچ کہا ہے کہ بزدل مرد اور بدصورت عورت کو جینے کا حق نہیں ہے۔''

میں نے کہا، ''عورت بدصورت ہو یا خوبصورت، مرد بہادر ہو یا بزدل۔۔۔ لیکن گھر عورت کے بغیر ہیجڑوں کا مٹھ (ڈیرہ) ہے۔۔۔ بہرحال بہادر مرد بھی کسی بزدل باپ کی اولاد ہوتے ہیں۔۔۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب تم ہی بتاؤ۔۔۔''

''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کی مائیں بہادر ہوں گی؟''

''۔۔۔۔۔۔۔۔''

''ہٹلر بہادر تھا۔۔۔ نپولین بہادر تھا۔۔۔ سکندر اعظم بہادر تھا۔ اہمیت بہادری کو حاصل ہے۔۔۔ یہ خاصیت ضروری نہیں کہ ان کی ماں کا کارنامہ ہو۔۔۔ عورت تو مرد کو بزدل بنا دیتی ہے۔''

''یوں نہیں ہے۔''

''تو پھر کس طرح ہے؟''

''مرد، عورت کے بغیر بے ہمت ہوتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ عورت بہادری عطا کرتی ہے۔۔۔ ورنہ مرد تو بزدل ہی ہوتے ہیں۔''

''نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔''

''اگر یوں نہیں ہے تو پھر بزدل مرد کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے اور بدصورت عورت کو بھی۔۔۔ تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا اور تسلیم کرو۔''

اُس کے سامنے میرے اکثر دلائل بھی ٹکا سا جواب دے کر غائب ہو جاتے تھے۔ آج جب میں سرخ پھولوں کی ڈالی لے کر اس کے دروازے پر گیا اور اپنی انگشتِ شہادت سے کال بیل کے بٹن پر زور دیا، بزر کی آواز تو میں ویسے بھی سن نہیں پاتا، بس قدموں کی آہٹیں نزدیک آئیں گی، کوئی بھی آئے گا، مجھے دیکھ کر بغیر کچھ بولے اندر چلا جائے گا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلنے کے ساتھ ''آیئے'' کی آواز بلند ہو گی۔ آج بھی میں ''آیئے'' کی آواز سن کر دہلیز پھلانگتے ہوئے بائیں طرف کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے کمرے میں پہنچا۔ وہ آئی، آتے ہی پنکھے کا ریگولیٹر گھمایا، پانی سے بھرا جگ اور گلاس میز پر رکھے اور وہی پرانا جملہ دہرا دیا،

''کیسے ہو؟''

''ٹھیک۔۔۔۔!''

کمرہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ وہی ترتیب، اُسی جگہ رکھے ہوئے صوفہ سیٹ، شیلف، سٹول پر رکھے گلدان میں مور کا پنکھ، نئی چیز تھی تو ایک شوپیس جو دیوار گیر گھڑی کے نیچے عموداً ٹنگا ہوا تھا۔ اُس میں خانے کچھ اس ترتیب سے بنے ہوئے تھے:

۱۔ خطوط

۲۔ پیغامات

۳۔ بل

۴۔ چابیاں

لیکن شوپیس کے سب خانے خالی تھے۔ پیغام نہ کوئی بل، کسی کا خط نہ کوئی چابی۔ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر گویا ہوئی، ''سہیلی آئی ہوئی ہے، اسے کچھ ٹائم دے کر رخصت کر آتی ہوں تم تب تک کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھ سکتے ہو۔''

وہ چلی گئی، سامنے میز پہ اس کی ڈائری پڑی ہوئی تھی۔ میں اُٹھا کر پڑھنے لگا۔

پہلا صفحہ:

آج میں نے کافی عرصے کے بعد ریڈیو سنا، پروگرام چل رہا تھا، ''یہ بچہ کس کا ہے؟''

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''علی جان!''

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'

''پشاور کا۔''

''آپ کی عمر کیا ہوگی؟''

''پتہ نہیں؟''

''گھر سے کیوں بھاگے؟''

''چچا بہت مار پیٹ کرتا تھا۔۔۔ پڑھاتا بھی نہیں تھا۔''

''اور آپ کی ماں؟''

''وہ لکڑیاں چنتے ہوئے پہاڑ سے گری تھی، مر گئی۔''

ریڈیو کا یہ پروگرام سن کر بہت تکلیف ہوئی۔

دوسرا صفحہ:

عورت فٹ پاتھ ہے، مرد اُس پر چلتا ہے۔ تبھی دونوں حادثات سے بچ پاتے ہیں اور زندگی کی ٹریفک میں گم ہو جاتے ہیں۔

پانچویں صفحے پر مرقوم ہے:

احساس کمتری میں مرد زیادہ ہے اور وہ عورت میں پناہ لے کے اسے گھر کی جیل میں بند کر کے اپنا قانون بناتا ہے۔

آٹھویں صفحے پر ہے:

خوش فہمی ہی جینے کے لیے طاقتور دلیل ہے۔۔۔

سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ بلند ہوئی اور کمرے میں آ کر ختم ہو گئی۔ میں نے ڈائری اُسی جگہ رکھ دی۔ اُس نے چائے کی ٹرے میز پر رکھی۔ اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہے، میں نے کہا، ''یہ نیا شوپیس تو

عام ہے۔ اس میں کون سی خاص بات ہے؟''

اُس نے کہا، ''نوجوان لڑکی کی زندگی میں اہم بات خط ہوتا ہے یا پھر پیغام۔ اس کے بعد چابی سے ہی اس کا قفل کھلے گا اور اس کے بعد بل ہی بل ہوں گے، جنہیں ادا کرنے میں دونوں اپنی زندگیاں گنوا دیں گے۔۔۔''

میں نے شوپیس کو گھورتے ہوئے کہا، ''شادی ہی تاریخ بناتی ہے۔''

اُس نے تیز لہجے میں جواب دیا، ''نہیں، نامکمل عشق نے ہی تاریخ اور جنگ کو جنم دیا ہے اور مجھے جنگ اور تاریخ دونوں سے نفرت ہے۔''

ہم دونوں بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ چائے کے مگ خالی ہو گئے، میرا دل بھر آیا۔ عجیب سے احساسات نے میری آنکھوں میں آنسو جگمگا دیے۔ میں اُٹھ کر باتھ روم چلا گیا۔ وہاں ٹاول سٹینڈ پر کپڑے اور ایک بریزیئر رکھا تھا۔ میں نے بریزیئر اُٹھا لیا اور ناک پر رکھا۔ پسینہ اور پاؤڈر کی خوشبو میری نس نس میں اترتی چلی گئی۔ میں آنکھیں بند کیے خود فراموشی کی حالت میں اسے سونگھتا رہا۔ ''واقعی ہٹلر نے سچ کہا ہے کہ بزدل مرد کو جینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔'' میں آنکھوں پر پانی کے چند چھینٹے مار کر باہر آ گیا اور صوفہ پر گر گیا۔

اُس نے کہا، ''خاموش کیوں ہو؟''

میں نے کہا، ''دو برس تک کئی راستوں پر گھومتے رہے۔ ان راستوں کے نام ہیں۔۔۔ ناموں کے معنی ہیں دوسرا راستہ اگر تیسرے میں مل جائے تو نام بدل جاتا ہے۔۔۔ زندگی بھی ایسے ہی ہے۔ کوئی کسی کی زندگی میں داخل ہو جائے تو نام ہی بدل جائیں۔۔۔ سورج مکھی کا وہ پھول آج بھی تمہاری ڈائری میں آدھا ہے۔ آؤ کہ اسے مکمل کریں، اسے ایک معنی دیں۔۔۔''

اُس نے کہا، ''شادی؟''

''میں نے کہا، ''ہاں''

''شادی بھی تو فطرت کے خلاف جنگ ہے اور مجھے جنگ سے نفرت ہے۔''

''تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟۔۔۔ شادی تو ایک سمجھوتہ ہے۔''

''سمجھوتہ۔۔۔؟؟ سمجھوتہ ہی تو سب سے بڑا دھوکہ ہے۔''

''نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔''

''کیا ایسا نہیں ہے؟ کیا دھوکہ جنگ نہیں ہے؟ اور مجھے جنگ سے نفرت ہے۔''

میرے رگ و پے میں اذیت کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اپنی پوری قوت مجتمع کرتے ہوئے کہا، ''جب تم وہاں اپنی سہیلی کے پاس تھیں تو میں نے تمہاری ڈائری کے کچھ ورق پڑھ لئے۔ تم نے لکھا ہے، 'عورت فٹ پاتھ ہے، مرد اس پر چلتا ہے، تبھی دونوں حادثوں سے بچ پاتے ہیں اور زندگی کی ٹریفک میں

گم ہو جاتے ہیں۔''

وہ صوفہ کے بازو پر بازو رکھے، ٹھوڑی کو اپنی ہتھیلی پر ٹکا کر کہتی ہے، ''وہ ایک عارضی سوچ تھی۔ میں فٹ پاتھ بننا نہیں چاہتی۔۔۔ میں تو زیبرا کراسنگ ہوں۔''

ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس کی چادر اس کے بالوں سے پھسل کر کاندھوں پر آ گئی۔ بالوں کا جوڑا اور گدی کے بال پنکھے کی ہوا پر اُڑ رہے تھے۔ وہ چھلکتی آنکھوں کے ساتھ کہنے لگی، ''میرا دل مکلی ہے۔ ہزاروں راستے مکلی کی طرف جاتے ہیں، جہاں ہزاروں راز دفن ہیں۔۔۔ میں اپنے دل کو اور وسعت دوں گی۔۔۔ تجھے تو پتہ ہے کہ میرا باپ وکیل ہے۔۔۔ سفید کو سیاہ، سیاہ کو سفید ثابت کرنے کے تمام دلائل اور ہتھکنڈے جانتا ہے جسے پسند کرے اسے بری کروائے یا پھر قیدی بنوا دے۔۔۔ لیکن وہ ابھی تک خاندانی روایات کی قید سے خود کو آزاد نہیں کروا سکا ہے۔ وہ میری دو بڑی بہنوں کی شادی نہ کروا کر پانچ آٹھ بچوں کا قبرستان بنا چکا ہے اور اب میں ہوں۔۔۔ میری یوٹیرس میں کوئی بچہ نہیں ہو گا۔ میرا پیٹ مکلی سے بھی بڑا قبرستان ہے۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا قبرستان ہو جائے۔۔۔ میں خاندانی منصوبہ بندی کے آپریشن کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی۔۔۔ اب آئندہ میرے لیے سرخ پھولوں کی ڈالی مت لایا کرو، کیونکہ مجھے کسی بھی مہینے کے پھول (ماہواری) ہی نہیں آئے اور نہ کبھی آئیں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عباس برمانی

سیاہ کار

میری نظامت تو اب پکی۔۔۔ سردار صاحب نے رات کے کھانے پر بلایا ہے کہا تھا اکیلے آنا۔۔۔ وہ رات کا کھانا دیر سے کھاتے ہیں اور دستر خوان پر انتہائی قریبی لوگ ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔۔۔ کہہ رہے تھے کہ تمہاری یونین کونسل کی نظامت کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس بارے میں تم سے مشورہ کرنا تھا۔۔۔ اور ہاں انہوں نے ہنس کر یہ بھی کہا تھا کہ ناظم تم بھی ہو سکتے ہو۔۔۔ اس نے بلند آواز میں خود کلامی کی میرے علاوہ اور ہو بھی کون سکتا ہے۔۔۔ پیسہ، تعلقات، برداری۔۔۔ اس حلقے میں میری ہم سری کون کر سکتا ہے۔

وہ کوہِ سلیمان کے دامن میں پھیلی ریتلی وسعتوں کے بیچوں بیچ گزرتی پختہ سڑک پر جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ اگرچہ مئی کا مہینہ تھا لیکن ایک پہر رات گزر جانے پر صحرا کی ریت ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اور ہوا میں خوش گوار خنکی تھی۔ رات چاندنی نہ تھی لیکن آسمان پر اس قدر ستارے تھے اور اتنے روشن تھے کہ ہلکی چاندنی کا گماں ہوتا تھا، کبھی کبھار کوئی گیدڑ، کوئی لومڑ یا کوئی خرگوش دوڑتا ہوا نظر آ جاتا تھا اور اگر جیپ کی ہیڈ لائٹس اس پر پڑتیں تو وہ سہم کر رک جاتا، سڑک عبور کرتی ہوئی ایک سیہہ (ساہی) کی آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ سڑک کے درمیان بیٹھ گئی، اس نے سٹیرنگ وہیل ذرا سا گھمایا اور اسے کچل دیا اور پھر ایک قہقہہ لگایا۔۔۔ کار ہوتی تو شاید سیہہ کے کانٹوں سے کوئی ٹائر پنکچر ہو جاتا لیکن یہ تو جیپ تھی اور وہ بھی جاپانی۔ یہ جیپ اس نے چند ہفتے قبل ہی خریدی تھی۔ اس سے قبل وہ کار ہی استعمال کرتا رہا تھا۔۔۔ ٹھیک ہے کاریں آرام دہ اور تیز رفتار ہوتی ہیں لیکن جیپ کی شان ہی اور ہے، کاروں کا بھی رعب ہوتا ہے لیکن جیپ کی تو باقاعدہ دہشت ہوتی ہے۔ کسی گاؤں کسی بستی میں چلے جاؤ وہاں کے باسیوں پر دہشت طاری ہو جاتی ہے اور کئی تو خوفزدہ ہو کر کونوں کھدروں میں دبک جاتے ہیں۔۔۔ جبھی سردار صاحبان جیپیں ہی استعمال کرتے ہیں۔۔۔ جیپ تارکول کی ہموار سڑک پر فراٹے بھرتی جا رہی تھی اور وہ سوچوں میں غرق تھا۔۔۔ مستقبل کے منصوبے اور خدشات۔۔۔ حال کے مسائل۔۔۔ ماضی کی کامیابیاں اور پچھتاوے۔۔۔ میں نے سیٹھ نذیر کو پھانس کر جیپ کی قیمت جتنی ''چٹی'' وصول کر تو لی ہے لیکن مجھے محتاط رہنا پڑے گا وہ خطرناک بندہ ہے، چپ بیٹھنے والا نہیں مجھے ضرور کسی چکر میں پھنسانے کی کوشش کرے گا۔۔۔ لیکن سردار صاحب مجھے اپنے گروپ کی طرف سے ناظم بنا دیں تو پھر وہ میرے خلاف کوئی حرکت کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔۔۔ سنا ہے آج کل اس کی صحت بھی خراب رہتی ہے، ملتان کے کسی جگر کے سپیشلسٹ کا علاج چل رہا ہے۔۔۔ صحت۔۔۔ بہن صحت مائی جانے کس حال میں ہو گی بددعائیں تو

بہت دیتی ہوگی۔ میں نے اسے بے گناہ کالی قرار دے دیا تھا۔۔۔ بد دعائیں کچھ نہیں ہوتیں۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ کووں کے کوسنوں سے ڈھور نہیں مرتے۔۔۔ اور پھر یہ پہلی بار تھوڑی ہوا تھا۔۔۔

بہن سے قبل رحیم بخش اپنی بیوی اور ایک بیوہ بھابھی کو بھی سیاہ کاری کا مرتکب قرار دے کہ ''چٹی'' وصول کر چکا تھا، بیوی کو تو اس نے قتل بھی کر دیا تھا ''وہ کتنی بڑی حماقت تھی'' اس نے سوچا ''لیکن وہ ایک جذباتی صورت حال تھی اچانک ہی ایسا ہو گیا تھا۔ اس میں میری منصوبہ بندی کو کوئی دخل نہیں تھا۔۔۔ غیرت کا تقاضا بھی تو یہی تھا۔''

ایک روز وہ اپنی پرچون کی دکان وقت سے پہلے بند کر کے گھر لوٹا تو اپنی بیوی کو اس کے ایک ماموں زاد بھائی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے پایا، اس کا وہ ماموں زاد اس کے ساتھ شادی کا خواہش مند ہوا کرتا تھا لیکن ناز و کا باپ پچاس ہزار روپے ''ناز و کا مول'' مانگتا تھا جو اس کی حیثیت سے بہت زیادہ تھا جبکہ رحیم بخش کے باپ کے پاس بھیڑ بکریوں کا بہت بڑا ریوڑ تھا اور وہ لوگوں کو سود پہ رقوم بھی دیا کرتا چنانچہ اس نے پچاس ہزار روپے ادا کر کے ناز و کو خرید لیا تھا۔ رحیم بخش جانتا تھا کہ اس کے ساتھ شادی سے پہلے ناز و اپنے ماموں زاد کو چاہتی تھی۔۔۔ اب جو اس نے دونوں کو ایک چھت کے نیچے ایک پلنگ پر بیٹھے دیکھا تو آگ بگولا ہو گیا اور دیوار پہ لٹکی ہوئی بندوق اتار لی۔ وہ دونوں قسمیں کھا رہے تھے کہ وہ بہن بھائی ہیں۔ لیکن رحیم بخش یہ ماننے کو تیار نہ تھا۔ جب وہ بندوق میں کارتوس ڈال رہا تھا تو لڑکا صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کر کے بھاگ گیا لیکن رحیم بخش نے بیوی کو قتل کر دیا۔ پنچایت بیٹھی مقدمین جمع ہوئے۔ منصفوں نے لڑکے کو کالا قرار دے کر دو لاکھ روپے چٹی عائد کی جو اس نے اپنی زمین اراضی اور مویشی بیچ کر ادا کی اس رقم سے رحیم بخش نے قریبی قصبے میں تھوک کا کاروبار شروع کیا دکان چل نکلی، باپ کا سودی کاروبار بھی اسے ورثے میں ملا تھا۔۔۔ چند برس میں اس نے میدانی علاقے میں کافی نہری اراضی خرید لی، بلدیاتی انتخابات ہوئے تو وہ کونسلر منتخب ہو گیا۔ پہلے واقع کے کوئی پانچ برس بعد سخی سرکار کے میلے کے موقع پر اس نے اپنی بیوہ بھابی کو گلی کی نکڑ پر ایک شخص کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تو ان پر سیاہ کاری کا الزام عائد کیا اور دونوں کو کالا کالی قرار دے دیا اب کے اس نے یہ عقل مندی کی کہ بھابھی کے خون سے ہاتھ نہ رنگے بلکہ اسے رکنی کے کھتر انوں کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے میں فروخت کر دیا۔ پنچایت نے کالے سے چار لاکھ روپے چٹی دلوائی وہ اس رقم سے ویگن خرید کر ڈیرہ فورٹ منرو روٹ پر چلانے لگا۔ ہر پھیرے پر ویگن مسافروں کے ساتھ کبھی چرس، کبھی ہیروئن اور کبھی اسلحہ لانے لگی۔ پولیس اور بارڈر ملٹری پولیس کو ان کا حصہ ادا کر دیا جاتا اور یوں چار سال میں اس کی ویگنوں کی تعداد چھ ہو گئی، اس نے ماڈل ٹاؤن ڈیرہ میں کوٹھی بنوالی، اس کے بچے پبلک سکول میں افسروں کے بچوں کے ساتھ پڑھنے لگے اس نے چار ٹرک اور دو آئل ٹینکر بھی خرید لیے۔ آئل ٹینکروں پر ایرانی پٹرول آنے لگا جبکہ ٹرک بھی پھلوں کے ساتھ اسلحہ، منشیات اور الیکٹرانکس لانے لگے۔

اگلے بلدیاتی انتخابات میں وہ یونین کونسل کا وائس چیئرمین بن گیا اور فریضۂ حج سے بھی سبکدوش ہو گیا اب وہ وڈیرہ حاجی رحیم بخش خان تھا۔

قصبے کا ایک شخص سیٹھ نذیر جو ڈیزرٹ کیمل ریس کے لیے بچے ابوظہبی سمگل کر کے مالدار ہو گیا تھا اس کے اثر و رسوخ کے لیے خطرہ بننے لگا تھا۔

ایک روز رحیم بخش چند شرفا کے ساتھ سیٹھ نذیر کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اس نے اپنی بہن صحت مائی کو وہاں سے نکلتے دیکھا، چنانچہ پنچایت بلائی گئی صحت مائی کو کالی قرار دے کر فروخت کر دیا گیا جبکہ سیٹھ نذیر سے پنچایت نے خاصی بڑی چٹی رحیم بخش کو دلوائی۔ صحت مائی کو جب باندھ کر ویگن میں بٹھایا جا رہا تھا اس وقت بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسے تو خود بھائی نے سیٹھ نذیر کے گھر بھیجا تھا اور کہا تھا کہ سیٹھ نذیر کی والدہ مائی جی بختاور بی بی نے جو بچپن میں اسے کلام پاک پڑھایا کرتی تھیں اسے بلایا ہے۔ اس چٹی کی رقم سے اس نے نئی جیپ خریدی تھی اور اسی جیپ پر وہ سردار صاحب سے ملنے جا رہا تھا بے آب و گیاہ ریتلا میدان ختم ہوا جھاڑیوں اور پستہ قد درختوں کے سلسلے شروع ہوئے پیلو اور ببول کے جھنڈوں سے گھرے ہوئے ایک موڑ پر ایک عورت اچانک جھاڑیوں میں سے نکلی اور بھاگتی ہوئی سڑک کے درمیان میں کھڑے ہو کر اسے رُکنے کا اشارہ کرنے لگی۔ اس نے گاڑی روک لی، شوخ رنگ لباس میں ملبوس چاندی کے زیورات سے لدی ہوئی سترہ اٹھارہ سالہ ایک خوبصورت لڑکی جس کے گلابی چہرے پہ زردی پھیل ہوئی تھی اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ''سائیں آپ کو خدا کا واسطہ، سخی سرکار کا واسطہ مجھے بچالو، وہ لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں وہ مجھے مار ڈالیں گے۔''

اس نے دیکھا کہ فرلانگ بھر کے فاصلے پر جھاڑیوں میں کئی متحرک روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

''چلو گاڑی میں بیٹھو'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ وہ اچک کر ساتھ والی نشست پر بیٹھ گئی، جیپ بڑھا دی گئی۔

'کون ہو تم اور یہ لوگ تمہیں کیوں مارنا چاہتے ہیں'

سائیں میں ٹبے والی بستی کی باسی ہوں میرا باپ مجھے ایک ستر سالہ بوڑھے کے ہاتھ فروخت کر کے اس رقم سے میرے بھائی کے لیے باز و خریدنا چاہتا ہے۔ اس بوڑھے کی تین بیویاں پہلے موجود ہیں اور ایک بیوی کو وہ کالی کر کے مار چکا ہے۔

کل وہ مجھے بیچ رہے تھے اسی لیے میں آج بھاگ نکلی

''اکیلی ہی''

''ہاں اکیلی'' گاؤں کے باہر غریب شاہ کی جھنگی میں کچھ نشئی پڑے رہتے ہیں ان میں سے کسی کی نظر پڑ گئی تو اس نے شور مچا دیا، اب وہ لوگ میرے پیچھے ہیں وہ مجھے مار دیں گے۔

''تم کہاں جا رہی تھیں''

''سائیں خدا کی زمین بہت بڑی ہے، کہیں تو مجھے امان مل جائے گی''

''مجھے کیا کرنا چاہیے'' وہ سوچنے لگا۔''اسے دارالامان چھوڑ آؤں۔۔یا چوٹی جا کر تھانیدار کے حوالے کر دوں۔۔۔یا رکنی والے پینڈو کے ہاتھ بیچ دوں۔۔۔لڑکی خوبصورت ہے اچھا مول ملے گا۔۔۔نہیں بات کھل گئی تو بہت نقصان ہوگا۔۔دارالامان ٹھیک رہے گا۔۔۔لیکن کیا یہ غیرت کے قانون کے مطابق ہے۔۔۔نہیں ہرگز نہیں، لوگ کہیں گے کہ حاجی رحیم بخش خان جیسے شخص سے یہ بے غیرتی سرزد ہوئی ہے اور پھر اس بستی کے لوگوں سے میں نے ووٹ بھی تو لینے ہیں۔۔۔وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا پھر اچانک اس نے یوٹرن لیا اور گاڑی واپس موڑ لی۔

''سائیں آپ کہاں جا رہے ہیں'' لڑکی خوفزدہ لہجے میں بولی

''اپنا فرض پورا کرنے'' رحیم بخش کا لہجہ پتھریلا تھا۔

اور جب اس نے گاڑی کوٹبے والی بستی کے کچے راستے پر ڈالا تو اس صحرائی ہرنی کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں'' سائیں آپ کو اللہ رسول کا واسطہ قرآن بادشاہ کا واسطہ سخی سرکار کا واسطہ مجھے ان بھیڑیوں کے حوالے نہ کریں آپ بھی بہنوں بیٹیوں والے ہوں گے۔غریب شاہ کی جھنگی کے قریب مسلح افراد کا جھنڈ موجود تھا۔رحیم بخش نے ایک سفید ریش پگڑ پوش سے کہا چاچا یہ سنبھالو اپنی عزت، یہ بھاگ رہی تھی میں اسے واپس لے آیا لڑکی کو گھسیٹ کر جیپ سے اتارا گیا''لعل بخش ماردو کالی کو'' سفید ریش نے ایک بندوق بردار نوجوان سے کہا ایک فائر ہوا اور زندگی سے بھرپور، جینے کی خواہش مند اور ایک آبرو مندانہ زندگی کے لیے جدوجہد کرنے والی لڑکی موت کی تاریک وادی میں ڈوب گئی۔

''یہ کیا کیا چاچا'' رحیم بخش نے کہا'' کالی کو کہیں بیچ دیتے۔

''ہم چٹی کھانے کو بے غیرتی سمجھتے ہیں'' بوڑھے نے سینہ تان کر کہا اور اس نے چند قدم آگے بڑھ کر لعل بخش کے ہاتھ سے بندوق لے لی' اس میں کارتوس' ڈالا اور انتہائی اطمینان کے ساتھ اس کا رخ رحیم بخش کی چھاتی کی طرف کر کے گولی داغ دی، رحیم بخش اپنے نظامت کے سنہری خوابوں اور غیرت کے خود ساختہ روشن تصورات کے ساتھ ایک سیاہ کاری موت مر گیا۔

''بابا اسے کیوں مار دیا یہ تو ہمارا محسن تھا''، لعل بخش نے پوچھا۔

''لڑکی پورا آدھا گھنٹہ اس کے ساتھ اکیلی رہی تھی اور تم یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ کسی کو کالی ثابت کرنے کے لیے ایک کالے کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

☆☆☆

لیاقت علی

نیون سائنز

نجانے یہ میرا وہم تھا یا واقعی میں مسز ولیم کو دیکھ رہا تھا۔نہیں یہ مسز ولیم نہیں ہو سکتیں۔ایسے تیسرے درجے کے خریداروں کے لئے سجے اس گنجان آباد بازار میں سرف بنانے والی چند پلاسٹک کی پیلی بوتلوں اور خام پاوڈر کی ڈھیریوں کے پیچھے ایک میلے سٹول پر اس بے تکلفی سے دکاندار سے باتیں کرتیں، یہ مسز ولیم کیسے ہو سکتی ہیں؟

شاید میری نظریں دھوکہ کھا گئیں۔میں اب اپنے شک کو دور کرنے کی خاطر دیسی برقعے اوڑھے، ناک بہاتے بچوں کو اُٹھائے پھیل پھیل کر چلتی خواتین کے رش کو چیرتا اُنہی پلاسٹک کی بوتلوں کی جانب بڑھا تو حیران رہ گیا کہ وہاں واقعی مسز ولیم بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھیں اور دکاندار آہستہ آہستہ دکان کا کاؤنٹر پر سجی بوتلیں اور خام پاوڈر کی پراتیں سمیٹ کر اندر رکھ رہا تھا۔

اُجلے رنگ کے کسی سجے سنورے لباس کے بغیر اس بوسیدہ لباس میں مسز ولیم کے پسینے سے بھیگتے سانولے چہرے کو دیکھنا میرے لئے کس قدر عجیب تھا شاید میں بیان نہ کر پاؤں۔ہاں مگر اسے میری شناسائی کا تقاضہ سمجھئے یا اُن کے اس سچ کا بھانڈا پھوڑنے کی خواہش کہ اب میں عین دکان کے سامنے کھڑا اس آس میں مسز ولیم کے بے خبر چہرے پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا کہ کب اُن کی نگاہیں میری طرف اُٹھیں اور میں بے ساختہ کہہ سکوں

"Good Evening Mam"

مگر یہ یونیورسٹی لائبریری کی طرف لپکتی دو طرفہ پھولوں سے سجی راہداری تھوڑا ہی تھی کہ جہاں مسز ولیم کے معمولات یوں تھے گویا کسی نے انہیں ایک بار ریکارڈ کرتے ہوئے آئندہ ہر نئے دِن کے لئے محض ریوائنڈ کے بٹن کو دبانا اور پھر سے اک نیا اُجلا روشن دن پلے کر دینا کافی جان لیا ہو۔

مسز ولیم ہمیشہ کی طرح کسی کھلتے ہوئے روشن لباس میں ملبوس خوبصورت دھوپ کا سیاہ چشمہ آنکھوں پر ٹکائے نہایت سلیقے سے کئے گہرے میک اَپ شیڈ میں اپنے بڑھتے ہوئے وزن اور لہراتے بالوں سے بے نیاز اونچی ہیل کی ٹک ٹک کے ساتھ پختہ راہداری پر چلی آ رہی ہوتیں اور سامنے سے آتے سٹوڈنٹس لمحہ بھر کو رُک کر"Good Morning Mam" کہتے تو گویا یقین آتا دِن کا آغاز ہو چکا ہے۔ جواباً ایک ثانیے کو مسز ولیم کے سنجیدہ چہرے پر بھی اپنائیت کی ایک لہر سی دوڑتی اور سر کو ذرا جھکاتے ہوئے وہ ہونٹ ہلا دیتیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بھی خیر سگالی کے یہی جذبات واپس پلٹا رہی ہیں۔

لائبریری کی سیڑھیاں چڑھتے سے شاید وہ شعوری طور پر اس احتیاط سے کام لیتیں کہ کمر میں خم نہیں آنے دیں گی۔ایسے میں اگر آپ انہیں لائبریری کے مرکزی دروازے میں کھڑے ہو کر سامنے

سے آہستہ آہستہ زینے چڑھتے دیکھیں تو کچھ ایسا احساس ہو کہ جیسے دم سادھے وہ اپنی اُٹھتی ہوئی چھاتیوں کا پیچھا کر رہی ہیں۔

لائبریری میں داخل ہوتے ہی وہ اپنا چشمہ اُتارتیں تو سامنے ایل شیپ میں سفید دودھیا ماربل کے کاؤنٹر کے اُس پار کھڑے ملازمین اُن کی نفاست کی داد دیے بغیر نہ رہ پاتے۔ ایسے میں وہ مسکراتے ہوئے تھینکس، تھینکس کہتے دائیں بائیں چھت پر لگی ٹیوب لائٹس پر نگاہ دوڑاتیں اور اگر کوئی راڈ بجھا ہوا یا ٹمٹماتا دکھائی دیتا تو اُس وقت تک بے چین رہتیں جب تک کہ دوبارہ اُسے چمکتے ہوئے نہ دیکھ لیں۔ اس سہ منزلہ لائبریری کی پہلی منزل پر لکڑی کے ایک کیبن کو آفس کی شکل دیتے ہوئے انہیں ملازمت میں ترقی کی خوشخبری کے ساتھ ساتھ اسی کیبن کے ہینڈل لاک کی ایک چابی بھی دی گئی تھی جو اَب ایک نہایت نفیس کی رِنگ میں لہراتی بالعموم ان کی انگلیوں میں دیکھی جا سکتی تھی۔

اس آٹھ مربع فٹ کے آفس میں موجود ایک ٹیوب لائٹ کو ناکافی جانتے ہوئے مسز ولیم نے کم وبیش پانچ مزید لائٹس کا بندوبست کروا رکھا تھا۔ جگمگاتی روشنیاں اور اُجلا سجا ہوا ماحول مسز ولیم کا خبط تھا۔ اپنے آفس میں داخل ہوتے ہی بے اختیار اُن کی انگلیاں یہ لائٹس آن کرتی چلی جاتیں اور آخری لائٹ آن ہونے پر وہ جیسے ایک پراطمینان سانس لیتیں کہ صدشکر ان سولہ گھنٹوں کی دوری میں یہ لائٹس خراب نہیں ہوگئیں۔ اپنی مقررہ نشست پر بیٹھتے ہی اُن کی انگلیوں کی پوریں پہلے سے چمکتی میز پر گرد کو محسوس کرتیں تو اُن کا انگوٹھا میز کے دائیں کونے میں لگے بیل بٹن پر اُس وقت تک پڑا رہتا جب تک کہ دو دو سیڑھیاں بیک وقت پھلانگتا، ہانپتا کوئی چپڑاسی کیبن میں نہ آن پہنچتا۔ یہی نہیں کچھ ہی وقت میں اُنہیں خیال آتا کہ ٹیوب لائٹس پر جمی گرد شاید آہستہ آہستہ روشنی کو ماند کر رہی ہے۔ ایسے میں چپڑاسی کی خصوصی ڈیوٹی لگتی کہ اِن راڈز کو اتارے اور پہلے نیم گیلے کپڑے سے صاف کرے اور بعد میں خشک کپڑے سے خوب چمکائے۔ ہاں اب یہ اُجلی دودھیا لائٹس اس قابل ہوتیں کہ مسز ولیم کو شکایت کا موقع نہ دیں۔

مگر آج یہ مسز ولیم کس حلیے میں تھیں؟

اتنی دیر سے وہ اس میلے سٹول پر بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھیں تو کیا ایک مرتبہ بھی انہیں اوپر لٹکتا وہ ساٹھ واٹ کا یرقان زدہ پیلا بلب دکھائی نہ دیا کہ جس پر مکھیوں نے سیاہ دانوں کا اِک جال بن رکھا تھا؟

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اُن کی نگاہیں میری طرف اُٹھیں اور میں نے نہایت ڈھٹائی سے اِک بناوٹی مسکراہٹ چہرے پر سجالی۔

"Good Evening Mam"

مسز ولیم چونکیں اور شاید ایک آدھ منٹ انہیں اسی فیصلے میں لگ گیا کہ وہ قبول کر لیں کہ ہاں وہ مسز ولیم ہی ہیں یا اُسی ڈھٹائی سے مجھے کہیں سوری آپ کو پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے کہ جس ڈھٹائی سے میں اُنہیں یہ جتلانے پر بضد تھا کہ ہاں میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔

آخر ایک منٹ بعد اِک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں گویا confess کرنا پڑا کہ یقیناً تمہیں پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی۔

مجھے بچپن کا وہ واقعہ یاد آ گیا کہ جب میں اپنی کرکٹ بال کے تعاقب میں اچانک اپنے ہمسائے میں مسز درانی کے یہاں دیوار پھلانگ کر داخل ہوا تو گھر میں کوئی موجود نہ تھا۔ ایسے میں میرا تجسّس مجھے مختلف کمروں میں لئے پھرتا رہا اور آخر میں نے باتھ روم کا ہینڈل لاک آہستہ سے گھماتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے ننگ دھڑنگ مسز درانی جسم پر سے پھسلتے جھاگ کے ساتھ آنکھیں موندے یوں شاور کے نیچے کھڑی تھیں گویا یوگا کا کوئی سٹیپ دہرا رہی ہوں اور میں ایسے میں اُس وقت تک خاموشی سے کھڑا اُنہیں دیکھتا رہا جب تک کہ اُنہوں نے آنکھیں کھولتے ہوئے پلٹ کر مجھے دیکھ نہیں لیا۔ اُس لمحے کچھ دیر تو مسز درانی بھی مسز ولیم کی مانند میری موجودگی کے وہم کو یقین میں بدلنے کا انتظار کرتی رہیں اور پھر نظر کے اس دھوکے کو میں نے کس معصومیت سے توڑا۔

''آنٹی آپ نے میری بال تو نہیں دیکھی؟''

آج بھی شاید میں نے اُسی معصومیت سے مسز ولیم کو کہا تھا

"Good Evening Mam"

اور ایک لمحے کو وہ بھی سوچتی رہ گئیں کہ اسے میرا خلوص سمجھیں یا کوئی سازش تاکہ آئندہ مجھے لائبریری سے نان اشوبکس بھی آسانی سے مل جایا کریں۔

اور پھر کچھ ہی دیر میں یہ کہہ کر کہ "Meet him my husband William"۔ مسز ولیم نے گویا میرے سر پر کوئی ہتھوڑا دے مارا۔ یہ میلے چیکٹ لباس میں ملبوس سرف بیچتا شخص ولیم کیسے ہو سکتا ہے؟ میرے ذہن میں پہلے سے موجود ولیم کے سچے اور اس جیتے جاگتے ولیم میں فوری مطابقت بہرحال ممکن نہ تھی۔

''میم آپ کے ہزبینڈ کہاں ہوتے ہیں؟''

ابھی کچھ ہی روز تو گزرے تھے کہ میں نے اُن سے پوچھا تھا اور اُنہوں نے بتایا تھا وہ بزنس مین ہیں۔

بزنس مین!

تو یہ بزنس تھا ان کا؟

مگر میں نے بھی تفصیل کہاں پوچھی تھی کہ مسز ولیم کی غلط بیانی پر دکھی ہوتا۔

بہرحال اِک یقین و بے یقینی میں، میں نے مسٹر ولیم کے اُس میلے ہاتھ کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ جو اُس سے بھی میلے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے اُنہوں نے میری جانب بڑھایا تھا۔

میرا بقیہ ماندہ تعارف کچھ اضافی قابلیت اور تعلیمی کارکردگی کے ساتھ مسز ولیم نے بیان کیا تو مسٹر ولیم ویری گڈ، ویری گڈ کہتے دکان بند کرنے میں مصروف رہے۔ کچھ ہی دیر میں شٹر گراتے ہم آہستہ

آہستہ بازار سے باہر نکلتے تو شاید کوئی اخلاقی تقاضا جانتے ہوئے مسٹر ولیم نے کہا:

''آج ڈنر آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں کر لیتے؟''

اس کھلی دعوت کے بعد مسز ولیم کے پاس بھی کیا کوئی چارہ تھا کہ وہ اس کی تائید نہ کرتیں؟

ادھر مجھے بھی اس ہزبینڈ کلائمکس کے بعد اُن کی ڈومیسٹک لائف جاننے کے تجسّس نے آن گھیرا تو میں نے فوراً ہاں کر دی۔

''مگر تمہاری ہاسٹل بس تو مِس نہیں ہو جائے گی؟''

مسز ولیم نے مجھے یاد دلایا کہ یونیورسٹی جانے والی آخری بس کو بہر حال ایک گھنٹے بعد روانہ ہونا تھا۔

''نو میم ایکچو لی میں آج رات شہر ہی میں کسی عزیز کے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

میں نے فی الفور اک بہانہ بنا لیا تو یہ بات اب کم و بیش طے تھی کہ ہم مسز ولیم کے گھر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

کچھ دیر پیدل چلتے چلتے ہم اب بازار کے عقبی محلے میں داخل ہوئے اور دو تین بڑی گلیوں سے گزرتے ایک چھوٹی بند گلی کے آخری مکان پر جا کر رُک گئے۔ مسز ولیم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک موٹی سی عورت چادر سنبھالتی باہر نکلی۔ مسز ولیم نے مسکراتے ہوئے اُس کا شکریہ ادا کیا تو وہ سامنے اک اور گھر کے کھلے دروازے پر لٹکے اک بوسیدہ پردے کو اٹھاتی اندر چلی گئی۔

گلی شاید دو تین بار پختہ ہونے کے سبب اس قدر اونچی ہو گئی تھی کہ گھر میں داخل ہونے کے لئے ہمیں دو زینے نیچے کو اُترنا پڑا۔ یہ ایک پرانی وضع کا چھ سات مرلے کا مکان تھا، جس کا صحن پختہ تو تھا مگر جگہ جگہ سے اُکھڑا ہوا تھا۔ مرکزی دروازے میں داخلے کے بعد ساتھ ہی گلی کی اونچائی کو دیکھتے ہوئے تین چار سٹیپ اوپر باتھ روم تھا جبکہ صحن ہی کی دوسری جانب ایک چھوٹے کمرے کی کھلی کھڑکی سے چھنتی روشنی باہر صحن میں بھی پڑ رہی تھی۔ شاید یہ اُن کا کچن ہوگا۔ بالکل سامنے ایک قطار میں دو کمرے تھے اور اُن کے سامنے برآمدہ جبکہ برآمدے کی ایک طرف اسٹور نما کمرہ کہ جس کے دروازے کا ایک پٹ نہیں تھا۔

مسز ولیم لپک کر اُس کمرے میں داخل ہو گئیں کہ جہاں سے بچوں کی ملی جلی آوازیں آتی سنائی دے رہی تھیں جبکہ مسٹر ولیم مجھے دوسرے کمرے میں لے آئے۔

کمرے میں پرانی وضع کے دو سنگل بیڈ اور ایک صوفہ رکھا ہوا تھا جس کی گدیوں کے کور جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے اور اُن میں سے شاید کسی نے چٹکیوں سے فوم کاٹ کاٹ کر نکال لی تھی۔ دیوار کے ساتھ اِک کیل کی مدد سے لٹکتے آئینے کے نیچے ایک چھوٹا سا سٹینڈ تھا کہ جس پر ایک ہیئر برش اور میک اَپ کا بے ترتیب سامان رکھا ہوا تھا۔ چھت پر لگا پنکھا گرد سے سیاہ ہو رہا تھا تو سامنے جلتا ایک بلب اب جمی ہوئی گرد کے سبب کسی لیمپ کا سا تاثر دے رہا تھا۔ بلب کے نیچے لٹکتی تانبے کی صلیب اور اس میں نصب خداوند یسوع مسیح کا مجسمہ بھی اب جمی ہوئی میل سے سیاہی مائل ہو چکے تھے۔

کچھ ہی دیر میں مسز ولیم کونوں سے ٹوٹے پلاسٹک ٹرے میں رکھی دو پلیٹوں میں سالن اور

رومال میں لپٹی روٹیاں لے آئیں جسے صوفے کے سامنے رکھی اُس میز پر چُن دیا گیا کہ جس کی گولائی کبھی شیشے کی ہوتی ہوگی مگر اب وہاں اک ہارڈ بورڈ کاٹ کر لگا دیا گیا تھا۔ کھانا رکھنے کے بعد مسز ولیم پلیٹیں اور پانی کا ایک جگ اور گلاس لے آئیں۔ اس پراسرار نیم تاریک ماحول میں اس قدر سکوت تھا کہ نوالہ چباتے ہوئے اک احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا۔

نیچے ہم بیٹھے خاموشی سے نوالے چبا رہے تھے تو اوپر دیوار پر دو کیلوں کے سہارے لٹکتی لاسٹ سپر (Last Supper) کہ جس میں خداوند یسوع مسیح اور ان کے بارہ حواری اپنا آخری کھانا کھا رہے تھے۔

برتنوں کی ہلکی پھلکی کھنک اور ایک آدھ مرتبہ ساتھ والے کمرے سے بچوں کی ابھرتی آواز بھی اس سکوت کو توڑنے میں ناکام رہی تو میں نے یونہی کوئی بھی موضوع چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

''میم آج نیوز سنیں آپ نے؟''

''کیوں کچھ خاص؟''

میم نے پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں کچھ خاص نہیں مگر بعض سیکیورٹی مسائل کی وجہ سے انگلینڈ نے کراچی میں ٹیسٹ کھیلنے سے انکار کر دیا ہے۔''

''ہاں مگر مجھے کرکٹ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔''

''او سوری۔''

پھر سے برتنوں کی کھنک ماحول پر حاوی ہوئی تو میں نے اگلے موضوع کا انتخاب کیا۔

"Mam Do you have kids?"

"Ya, Three"

بڑی بیٹی ایٹ ائیرز کی اور پھر دو سال کے وقفے سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی اور۔

''او ریئلی۔ How Nice۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ What a nice family۔''

مجھے اطمینان ہوا چلو یہ سکوت تو ٹوٹا جو ہر گزرتے پل کے ساتھ کہیں سے مجھ سے پوچھ رہا تھا آپ نے واپس کب جانا ہے؟

مگر میں اپنے تجسّس میں یہاں آن ہی پہنچا تو کھانا تو بہر حال مجھے ختم کرنا ہی تھا۔ گھڑی پر نگاہ دوڑائی تو ابھی یونیورسٹی بس جانے میں پچیس منٹ باقی تھے۔

''ویسے سر ایک بات ہے۔ سنا ہے بیٹیاں باپ اور بیٹا ماں کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ Is it right?۔''

اس بار میں نے محض چہرے کے تاثرات سے محفل میں شریک مسٹر ولیم کو مخاطب کیا تو وہ کچھ دیر تو سوچتے رہے اور پھر کندھے اچکاتے ہوئے بولے ''ممکن ہے ایسا ہی ہوتا ہو۔''

''ہوتا ہو! یعنی آپ کا believe نہیں اس پر۔''

''Shut up جواد۔

"All these are nonscene"

میم نے اس موضوع کو بھی سمیٹتے ہوئے بے زاری سے کہا۔ مگر فی الوقت میرے پاس اس خاموشی سے لڑنے کے لیے کوئی اور موضوع بھی تو نہ تھا۔

''اچھا میم کون سے سکول میں پڑھتے ہیں سب؟''

میرا اگلا روایتی سا سوال یہی ہوسکتا تھا۔

''ایکچولی۔۔۔''

اور اس سے قبل کہ میم کچھ کہتیں مسٹر ولیم کو یاد آیا کہ انہوں نے سگریٹ نہیں خریدے اور بنا سگریٹ رات کاٹنا شاید دشوار ہو جائے۔ وہ معذرت چاہتے ہوئے سگریٹ لینے چلے گئے تو میم برتن سمیٹتی کچن کی جانب چل دیں۔

میں نے کمرے میں آس پاس نگاہ دوڑائی کہ شاید کوئی ٹشو پیپر کا ڈبہ دکھائی دے تو میں ہاتھ صاف کرسکوں لیکن مجھے کہیں ایسا کوئی ڈبہ دکھائی نہ دیا۔ سامنے کمرے کا دروازہ اب کھلا تھا اور برآمدے کے اُس پار بیرونی دروازے کے ساتھ باتھ روم کی لائٹ جل رہی تھی۔ میں اُٹھا اور ہاتھ دھونے کے لیے باتھ روم کی طرف چل دیا۔

ہاتھ دھو کر میں واپس کمرے کی طرف پلٹا تو ساتھ والے کمرے سے مسز ولیم کی قدرے سخت مگر دبے ہوئے لہجے میں آواز سنائی دی۔

''Mind it۔ کوئی باہر نہیں آئے گا۔''

اوہو۔۔۔ وہی مڈل کلاس عورتوں کا پرانا طریق۔ یعنی مہمان اگر اچانک گھر آجائے تو میلے کچیلے بچوں کو وقتی طور پر کہیں پیک کر دینا چاہیں گی۔ مگر میں کون سا اپر کلاس کا کوئی پُرتکلف مہمان تھا جو میرے آنے پر بچوں کو چھپا دیا جائے۔ چلو چل کر بچوں سے ملا جائے اور اُنہیں کچھ پیسے ہی دے دیئے جائیں۔ پہلی بار میم کے گھر آیا ہوں تو کم از کم اتنے مینرز کا ثبوت تو دینا چاہیے۔

اس خیال کا آنا تھا کہ میں از خود اُسی کمرے کی طرف چل دیا جہاں بچوں کو باہر نہ نکلنے کی وارننگ دی جارہی تھی۔ اچانک مجھے دروازے میں کھڑا دیکھ کر میم کچھ یوں گھبرا سی گئیں گویا میں نے اُن کی کوئی چوری پکڑ لی ہو۔

اُدھر میم کے تینوں بچے میری آہٹ پر ہاتھوں سے اک دوسرے کو ٹٹولتے سہم کر کوئی گٹھڑی سی بن گئے۔

''سوری میم۔۔۔ وہ میں نے سوچا کیوں نہ بچوں سے۔۔۔''

اور قبل اس کے کہ میں کچھ مزید کہتا میم بولیں۔

''جوادا ایکچولی میں تمہیں بتانے ہی والی تھی کہ یہ سب I mean۔۔۔''

''It's OK Mam۔

میں نے کہا تو میم کا کپکپاتا چہرہ ایک لمحے کو ساکت ہوا اور پھر وہ ایک گھونٹ سا بھرتے ہوئے بولیں۔

''But they have some extra sences۔ ابھی حال ہی میں اس بڑی والی نے پورے سکول میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی ہے اور یہ چھوٹا سپرمین ۔۔۔اُف مائی گاڈ۔۔۔ How can I tell you Jawad؟

Would you believe me? کہ یہ گھر کے کسی بھی کونے میں رکھی کوئی بھی چیز یوں اُٹھا کر لا سکتا ہے کہ دیکھنے والا کبھی یہ ماننے کے لیے تیار نہ ہو کہ اسے دکھائی نہیں دیتا۔

اور یہ چھوٹی والی My little sweet doll اپنے پاپا کی جان ہے۔

ماں بھلے ہی اسے سنائی دے یا نہ دے باپ کی آواز اس کی زندگی ہے۔ دیوانی ہے یہ ولیم کی آواز کی۔'' مسز ولیم نے تیزی سے سب کا تعارف کروایا۔

بچے اب دوڑ کر اُن کی ٹانگوں سے لپٹ گئے تو وہ انہیں بانہوں میں سمیٹتے ہوئے بولیں۔ ''چلو سب بڑے بھیا کو ہینڈ شیک کرو۔''

تینوں نے بیک وقت مختلف اطراف میں اپنی ننھی ننھی ہتھیلیاں بڑھا دیں تو میں نے اُن کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے یہ ننھے ہاتھ اپنی مٹھیوں میں دبا لیے۔

"How sweet they are"

میں نے اس پیار سے کہا تو مسز ولیم کی آنکھیں خوشی سے بھر آئیں اور انہوں نے سینے پر کراس کا نشان بناتے ہوئے آنکھیں موندیں اور یوں ہتھیلیاں جوڑ لیں کہ انگلیوں کی پوریں ان کی ٹھوڑی کو مَس کرنے لگیں۔

''اے باپ! بے شک تُو ہی تو ہے جو ہر تاریکی میں نور بھرنے والا ہے۔'' آہستہ سے مسز ولیم نے یہ دعائیہ کلمات ادا کیے اور نم پلکیں اُٹھا لیں۔

''مجھے شاید چلنا چاہیے۔''

میں نے کچھ شرمندہ شرمندہ سی مسز ولیم کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ کوئی جواب نہ دے پائیں۔ نیم تاریک صحن کے اکھڑے ہوئے فرش سے گزرتے ہوئے اب ہم بیرونی دروازے کی طرف بڑھے تو شاید کسی پاتال سے مسز ولیم کی آواز سنائی دی۔

''جواد مائی سن If you don't mind وہ کیا ہے نا کہ ڈیئر ہر شخص اپنے اپنے انداز میں سوچتا ہے اور پھر جتنے منہ اتنی ہی سٹوریز۔ کسی سے مت کہنا کہ تم یہاں آئے تھے۔''

مسز ولیم کے لہجے میں شرمندہ کر دینے والی درخواست تھی۔

میں منہ سے کچھ نہ کہہ پایا فقط خاموشی سے اثبات میں سر ہلاتا تیز تیز ان گلیوں سے گزرتا بڑی سڑک پر نکلا تو شہر جیسے نیون سائنز کی جگمگاتی روشنیوں میں نہا رہا تھا۔

عطاالرحمٰن تمثیل

سفید جسم

وقت گزرتا جارہا تھا اور جس کے ٹھہرنے کا انتظار میرے علاوہ اور کسی کو نہ تھا۔ مجھے ہزاروں آنکھیں غم وغصہ اور رحم وترحم کے انداز میں یوں دیکھ رہی تھیں جیسے میں کوئی نہایت مکروہ اور قابلِ نفرت مخلوق ہوں، لیکن ایسا نہیں تھا۔ میں واقعی ایک انسان تھا جسے خود پتا نہیں تھا کہ وقت کیوں گزرتا جارہا ہے۔ اس کا جسم سوائے ایک عضو کے بے جان کیوں ہے؟

خاص طور پر نچلا دھڑ بالکل امیبا کی طرح ٹھنڈے پانی میں پڑا تھا جو روشنی کی تلاش میں سوڈوپوڈ یک حرکت کا بھی متحمل نہ تھا۔

''یہ سب کیا ہوا ہے؟''

ایک ڈاکٹر نے جسے میں بغور دیکھ رہا تھا اپنی سیاہ آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے نہایت کرخت انداز میں میرے پاس کھڑے ہوئے فرشتۂ رحمت سے پوچھا۔

''کچھ نہیں سر!''

''بہت سیریس کیس ہے سر!''

''مریض کا خون نہیں رک رہا۔ انجکشن لگا لگا کر ہم تھک گئے ہیں۔ ہمیں خطرہ ہے کہ اگر یہ بچ بھی گیا تو اسے فالج ہو جائے گا۔ جنسی فالج تو لازم ہے اور انتڑیوں کا فالج تو شاید ہو چکا ہو۔''

''اسے کون لایا ہے؟''

''یہ لایا ہے، سر!''

اس نے میرے پاس کھڑے ہوئے ایک نہایت موٹے اور ہٹے کٹے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ یہ انسان بھی مجھے اچھا لگا جو اپنی گھنی مونچھوں کے پیچھے پیلے پیلے دانت نکال کر کھسیانی ہنسی ہنسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''صاحب! ہم لایا ہے۔''

''کہاں سے؟''

''ڈیفنس موڑ سے۔''

''صاحب! یہ اسی حالت میں وہاں ننگا پڑا تھا۔ ہم نے اسے کپڑا پہنایا یہ بولتا نہیں تھا۔ ہم نے اسے بہت ہلایا اور پھر یہاں تک لایا۔''

''اس کا کیا نام ہے؟''

''پتا نہیں سر!''

''اخبار میں دے دیں۔''

''اخبار میں کیا دیں گے؟''

''اس کا بچنا مشکل ہے فوراً اس کے لواحقین کا اتا پتا تلاش کرنے کی کوشش کرو۔''

''یس سر!''

''اس طرح کے کیس ہمارے ایسے ملکوں میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کا علاج تیز کر دیں۔''

ڈاکٹر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

''اگر ہم نے اسے بچا لیا تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔''

''یہ موبائل نمبر ہے۔ فوراً ڈاکٹر عرفان کو طلب کریں اور انہیں میری طرف سے بتائیں کہ اس نوجوان کو بچانے کی پوری پوری کوشش کریں۔''

میں یہ سب سن رہا تھا۔ مجھے تکلیف، نقاہت اور مدہوشی کی ملی جلی کیفیت میں یہ سارا ماحول نہایت غیر مرئی لگ رہا تھا۔ یہ سارے لوگ کیا کر رہے تھے؟ اور کیا کہہ رہے تھے؟

وقت گزر رہا تھا اور میں برف کی پٹیوں کے درمیان اپنے آپ کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ دوسرا دن تھا۔ میں نے لوگوں کو پہچاننا شروع کر دیا تھا۔ یہ کون میرے ماتھے پر ٹھنڈا ہاتھ رکھے ہوئے ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ بول تو نہ سکا البتہ میری آنکھیں بولنے لگیں اور ایک نمکین سیال میرے منہ میں جانے لگا۔ اس نے بڑے پیار سے انہیں صاف کیا اور بڑے شفیق انداز میں کہا۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

اسی دوران وہ رحمت کا فرشتہ آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی موٹی سرنج تھی جو اس نے کچھ دیر ٹٹولنے کے بعد میری رگ میں گھسیڑ دی۔ سیال سرخ سیال سے بھر کر۔ ٹک! ٹک! واپس جانے لگا۔ دروازے کے پاس رک کر اس نے کہا۔ ''پریشان مت ہوں ہم اسے بچا لیں گے۔''

مجھے ہوش آ رہا تھا۔

کل مسٹر لاہور کا مقابلہ تھا اور مجھے اپنی باڈی پوزنگ کرنی تھی لیکن یہ میں کہاں پڑا تھا؟

ملکہ پربت عبور کرنے کے لیے تو بہت حوصلہ چاہیے تھا مگر مجھے جھیل سیف الملوک کے ٹھنڈے پانی میں نہلا دیا گیا تھا، نہلایا جا رہا تھا اور مجھے اپنے اردگرد سبز، سرخ، سفید اور عریاں جسموں والی پریاں نظر آ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں ہوس تھی، ہونٹ سرخ لالے کی طرح بہت سرخ تھے۔ شاید وہ میرا خون پی کر امر ہو جانا چاہتی تھیں وہ ساری کی ساری میرے گرد اکٹھی تھیں اور اپنی باری کے انتظار میں میرے سرخ ہوتے ہوئے گلابی گال اور ہونٹ چوس رہی تھیں۔ ان کے لمبے سیاہ بال میری آنکھوں اور چھاتی پر گرے ہوئے تھے جو مجھے کالے ناگ لگ رہے تھے جو ابھی اپنی غاروں کے منہ کھول دیں گے اور

میں لڑھکتے ہوئے پتھر کی طرح ان میں گر کر گم ہو جاؤں گا۔

بزرگوں نے صحیح کہا ہے کہ جھیل سیف الملوک پر چاند کی چاندنی میں اکیلے نہیں جانا چاہیے۔ یہ منظر انسان کو اتنا نڈھال اور پُر کیف کر دیتا ہے کہ ملکہ پربت عبور کرنے کا حوصلہ رکھنے والا بھی ٹھنڈے پانی میں اُتر جاتا ہے۔

مجھے کچھ یاد آ رہا ہے!

اچانک میں نے ایک دردناک چیخ ماری۔ شاید مجھے انجکشن لگا دیا گیا تھا۔ میرا نڈھال بدن دوبارہ سے تر و تازہ ہو کر پسینے میں نہا گیا۔ مجھے پھر ہوش نہ رہا میں اب آنسو جھیل کی طرف چل رہا تھا۔ پریاں میرے پیچھے تھیں میں اب بھاگ رہا تھا، ایک پری نے مجھے بانہوں میں لے کر ایک لمبا بوسہ دیا۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں وہ مجھے آبِ حیات پلا رہی تھی شاید یہ امر ہو جائے! شاید یہ! شاید یہ امر ہو جائے!

وہ میرے بدن سے کوئی چیز تلاش کر رہی تھی پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا میں اُڑ رہا تھا۔ ہوا میں موجود غالیچہ میرے قدموں سے کھسک رہا تھا۔ برف کے گالے، ٹھنڈے گالے، نرم نرم گالے میری گالوں کو چھو رہے تھے، ایک لمس میرے بدن اور روح میں یوں سرایت کر رہا تھا جیسے کوئی ڈول کو کنویں میں ڈالنے کی کوشش کر رہا ہو، ملکہ پربت بہت دُور ہے۔

پھر ایک نئی آواز، رحم کی بھیک مانگنے والی آواز، کانوں سے ٹکرانے لگی۔ مجھے یوں لگا کہ اب یہ بھی چاقو سے گدگدی کرنے کی کوشش ہو گی۔

''یہ پیاسی پریاں ہیں میں ذرا بوڑھی پری ہوں مدتوں سے غار میں پڑی ہوں مجھ پر کسی دیو نے آکاس بیل پھینک کر خشک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے بدن کے کانٹوں میں بہت چبھن ہے لیکن ایسی چبھن ہے جو سرشار کر دیتی ہے۔''

شاید مجھے پھر ہوش آ رہا تھا اس نے میرا جسم سہلانا شروع کر دیا۔ مجھے ہوش آ رہا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ آسماں نیل پوش چادر میں لپٹا ہوا چاند کا کھلکھلاتا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پری مجھ پر جھکی ہوئی تھی اس کے بدن کی خوشبو میرے نتھنوں میں جا رہی تھی۔ وہ مجھے نرم و نازک اور تر و تازہ و ملائم گھاس پر لٹا کر انگریزی کا لفظ آٹھ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں ایک سنسان سڑک پر گاڑی اتنی تیز چلا رہا ہوں کہ میرا بدن بار بار کبھی ڈیش بورڈ سے اور کبھی سیٹ کی بیک ہک سے بُری طرح ٹکرا رہا ہے۔ سپیڈ بڑھتی جا رہی تھی اسٹیرنگ پر میری گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ اچانک گاڑی کو جھٹکے لگنے لگے۔ شدید جھٹکے، مجھے گاڑی کی چھت اپنے اوپر گرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ آخر آخری جھٹکے کے ساتھ شدید کرب میں مَیں نے اپنا سر اسٹیرنگ پر پھینک دیا تھا۔

یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟

''ڈاکٹر عرفان! یو آر گریٹ!''

''مریض ہوش میں آ رہا ہے۔''

بھاگتا ہوا رحمت کا فرشتہ میرے پاس آیا اور میرے دوست سے مخاطب ہو کر بولا۔

''آپ کو مبارک ہو۔ سارے ٹیسٹ ہو چکے ہیں مریض کو ایڈز نہیں ہوا۔ اب انہیں بچایا جا سکتا ہے۔''

میرے دوست کو پتا چل چکا تھا کہ میں سیف الملوک میں نہاتا رہا ہوں جو پہاڑوں کی تیز دھوپ سے پگھلتی ہوئی ٹھنڈی برف کو مائع بنا کر گرمی میں جھلستے ہوئے میدانوں میں پھینک دیتی ہے۔

مجھے مکمل ہوش تھا۔

لیکن وقت گزرتا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر رحمت کے فرشتے سے کہہ رہا تھا۔ ''تم زیادہ سے زیادہ مریض کے پاس رہو۔ اسے مخصوص جسمانی مساج کی ضرورت ہے اور کوشش کرو کہ اس کے جسم میں ارتعاش پیدا ہو۔''

''ڈاکٹر صاحب! یہ عجیب و غریب حرکات کرتے ہیں جو کبھی کبھی ناقابلِ برداشت ہوتی ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا!''

''آج آخری ٹیسٹ ہے۔ ان کا کمرہ چھوڑ دیں۔''

مجھے مخصوص مشینوں کے کمرے میں لے جایا گیا۔ ایک بار پھر انجکشن دیئے گئے۔ میری بلیڈنگ رک چکی تھی اور میں نیم مدہوشی کی کیفیت میں پگھلتی ہوئی برف کو بھاپ بن کر بادل ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پہاڑوں سے گرتی ہوئی برف کو جذب کر رہا تھا۔ ٹھنڈے پانیوں میں جسم کو گرم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سرد ہواؤں کے تھپیڑے سہہ رہا تھا۔ چاندنی سے گھبرا رہا تھا اور چاند اور چکور کے برعکس سورج کی طرف منہ کر کے بھاگ رہا تھا لیکن دوسری طرف میرے ہاتھ کسی مخروطی نرم و نازک پھلوں کی تلاش میں تھے۔ انگلیاں کھلتی تھیں اور بند ہوتی تھیں۔ ہونٹ جڑتے تھے اور کھل جاتے تھے۔ ٹانگیں ایستادہ ہوتی تھیں اور گر جاتی تھیں۔ سینے پر بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ سانس کی نالی میں جلن ہونے لگتی تھی۔ کانوں کی لوئیں توے کا کنڈا بن جاتی تھیں آنکھیں انگارہ ہو جاتی تھیں۔ شاید میں ٹھنڈے پانی میں نہیں آگ میں کھیلتا رہا تھا ایسی آگ جو سات تہہ خانوں میں قید بے گناہ قیدی کو بھی مجرم بنا کر لے گئی تھی اس کا باپ رو رو کر اندھا ہو گیا تھا مگر میرے رونے والے تو لاعلم ہی نہیں تھے بلکہ خوش تھے کہ میں جھیل سیف الملوک کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں گا۔

آخری بات جو مجھے یاد تھی وہ یہ تھی کہ پی لیں! پی لیں!

یہ آبِ حیات ہے، دوا ہے اور دوا ہے تو دعا ہے۔

اور پھر میں بدھ کی سی استقامت سے نہ بیٹھ سکا۔ میں لیٹ گیا اور میرے اوپر منوں برف گرتی رہی اور میں نیچے کی تہہ میں پڑا سیال مادے کی طرح پگھلتا رہا اور جمتا رہا۔

وقت گزرتا رہا اور ڈاکٹر بھاگتا رہا۔

رحمت کا فرشتہ انجکشن پر انجکشن لگاتا رہا۔ دوست پٹی سے لگا سر سہلاتا رہا اور میں کروٹیں بدل بدل کر باڈی پوزنگ کرتا رہا اور پریوں کے ابدان میری آنکھوں کو خیرہ اور جسم کو ٹٹولتے رہے۔ مشینیں چلتی رہیں۔ دوائیاں انڈیلی جاتی رہیں۔ ڈرپ میں انجکشن پڑتے رہے۔ خون کی بوتل گلِ لالہ بنی رہی مگر مجھے یاد ہے میں بستر پر پڑا تھا۔

ڈاکٹر نے کہا سانس بند ہو رہی ہے۔ سلنڈر بدلو۔ سلنڈر اتارا گیا اور ایک آخری جھٹکے کے ساتھ میں اونٹ کی کوہان کو پکڑتا ہوا گرم صحرا کی ریت میں جذب ہو رہا تھا اور وقت ٹھہر گیا تھا !!!

☆☆☆

ابرار آبی

قصہ دوسرے آخری درویش کا

تیسرے درویش کے نیم جاں اشتیاق کو اعزاز جانا اور دوسرا آخری درویش یوں گویا ہوا۔

''یارو! درویشی شہادت گہِ ہمت میں قدم رکھنے کا نام ہے۔ قناعت جوانعام ہے، پرہوس کا انجام ہے ایثار کا ثواب ہے، زور کا سیلاب ہے، حساب نہ کتاب ہے پر جُرمِ غریبی کو احتساب ہے۔ اور۔ اور۔۔۔''

چوتھے درویش نے تقریرِ دل پذیر میں وقفے کو غنیمت کیا اور مشاق تجزیہ نگار کی صورت بنا کر رائج الوقت خلوص سے پوچھا ''صحرائے درویشی کے آزمودہ کار مسافر! کچھ دن سے درویشی کا نیا رنگ چار سُو ہے جو حقیقی درویشی سے موسوم ہے اور کثرت سے اخبار میں مرقوم ہے۔ بابت اس کے کچھ ارشاد ہو۔''

دوسرے آخری درویش نے (جسے فنی تقاضوں سے قطع نظر اور رعایتِ نثری کے تحت آخری سطور تک آخری درویش ہی لکھا جائے گا اور پڑھا جائے گا) چوتھے درویش کو حلقہ التفات میں لیا اور بولا ''امر کوئی بھی ہو عوامی ہو کہ حقیقی ہو، چنداں مضائقہ نہیں۔ اصل تو یہ کہ گرد میں جو بھی بیٹھا، پکڑتا داڑھی کو ہے، عجب احوال ہے، اک محشرِ خیال ہے۔'' درویش نے باقی درویشوں کو اک نظر دیکھا اور داد جواب کی چاہی۔

موافق اپنی ہمت کے سب نے دانائی کو اپنے اپنے کھیسے میں رکھا، لحظے کا سکوت ہوا درویش پر کیف کا عالم ہوا، اچانک درویش نمبر دو التجا پذیر ہوا ''اے مردِ عاقل! حقوقِ مداخلت در معقولات ازاں جملہ درویشان شتابی معطل ہوں کہ قصے کا پلاٹ اور چاشنی خدشات ہوئے جاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر دوسرے درویش نے اک نظر ہمراہیوں پر ڈالی کہ حرف کوئی استحسان کا گوش پذیر ہو۔ مایوس ہوا کہ یہ روایت بھی عنقا ہوئی کہ آخری درویش کے لبوں کو جنبش ہوئی، ماحول اور بھی طلسمی سا ہوا ''یہی ڈھنگ ہے کہ الجھائے رکھو اہلِ ہنر کو۔ الٹی راہ پر لگائے رکھو، کہ بقائے مشیراں اسی میں ہے، خیر خاطر جمع رکھو کہ اہتمامِ تسلسل در قصہ ترجیحِ اوّل ہے۔''

درویشوں نے قدرے سکون کا سانس لیا۔ درویش نمبر ایک جسے آخری درویش سے دعویٰ قدیمی رفاقت کا تھا اور اپنے تئیں خاص آدمی آخری درویش کا سمجھتا تھا، بولا ''گرچہ قصہ درویشوں کا استحقاق بھی ہے اور یارانِ محفل مشتاق بھی ہیں، پر عاجز کی رائے یوں ہے کہ نسبت قصہ کی اگر نکتہ ہائے دانش کی عنایت ہو تو کیا خوب ہو؟ پہلے درویش کی رائے کا سننا تھا کہ تیسرے درویش نے طویل سکوت کو کلام کیا اور دست بستہ ہو کر جسارت نما گویائی سے گرمیِ محفل کا اہتمام کیا۔ ''پیرِ درویشانِ نصف عالم!''

گزری نشست میں تحریر و تقریر ملی تھی کہ ملاقاتِ استقبال میں تکمیلِ قصہ کا اہتمام دل پذیر بہر طور ہوگا مگر علامات تا حال دُور دُور تک نہیں، یہ ابطالِ عہد نہیں کیا؟'' آخری درویش نے جملہ لوازماتِ

درویشی (بلحاظ شخصیت وعہدہ) پر اک نظر غور کیا، احساسِ تیقن سے معمور ہو کر تیر وتفنگ سے جلال کے اپنے تئیں آراستہ کیا اور فیصلہ کن طرز میں بولا ''ایفائے عہد وطیرہ اسلاف نہیں ہے، محبت، جنگ اور قومی مفاد میں جواز ہر شے کا نکلتا ہے ادراک سے عاری ہو کہ استفساری ہو۔''

دوسرے درویش نے ہاتھ بلند کیا اور اذن تکلّم کا چاہا پر پہلے درویش نے عجلت میں مصلحت کو فہم جانا، محبِّ وطن درویش کا روپ بھر کے سنگینیٔ کیفیت کو زائل کرنے کی سعی کی ''بیشتر کو منظور ہو تو کیوں نہ قصہ کو درویشِ جہاندیدہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے؟ اب کے دوسرا درویش مضطربِ کمال ہوا، صبر محال ہوا، توجہ دلاؤ قسم کے استفسار کے ساتھ آخری درویش سے مخاطب یوں ہوا کہ باقی درویش بحر حیرت و استعجاب میں غوطہ زن تھے۔ ''اے پیر جہاں گرد! درویشی و قصہ میں تسلسل و روانی، دستیاب پسندیدہ و ناپسندیدہ واقعاتِ عالم میں مرقوم ہے مگر بار بار کی طالع آزمائی اور ساختِ عمارت نو کا شوق محض اسیری دائروں کی ہے۔ ملعون و مقہور ہمسائیگی میں بھی یارانِ تیز گام منزل کو پہنچنے کو ہیں اور یہاں روایتی وفاداران اختیار ہنوز ''صوابدید'' کو مشکل کشائی کا ہنر فہم کیے بیٹھے ہیں، گزارش ہے کہ قصہ کو بہر طور مسلسل کیا جائے کہ استحقاق اپنا مضروب نہ ہو۔''

آخری درویش اس گفتارِ ناگہانی پہ بحر اضطراب میں غوطہ کھانے لگا۔ ہاتھ پاؤں مارا کیے۔ بصد کوشش بحال اپنے حواس کیے تو پیشانی پر ''گوہر ہائے آبدار'' گزرے ہوئے طوفان کے مخبر تھے۔ خیر شتابی سے معاملہ کی نزاکت کو جانا۔ زمین رسا کا آخری کونہ تک چھانا اور ہنگامہ استدلال تخلیق کیا۔ ''اے راہ نوردانِ شوق! درایں چہ شک کہ قصہ گوئی فنِ قدیم ہے، فیض اس کا تسلیم ہے، پر سا کنانِ خطۂ درویشی، قصہ گوئی درلباسِ اصل یاں قبول نہیں کہ ہر کس و ناکس مدعی قصہ ہوا جاتا ہے، طبع نازک کو یہ منظور نہیں اور اختلاط خاص و عالم اسلاف کا دستور نہیں۔ یہی اسباب ہے کہ بسا اوقات اہتمامِ ترتیبِ نو در قصہ مجبوری ہے۔''

غالباً ایک یا دو مزید ناگوار خاطر قسم کے استفسارات سے مضرنما خلاصی پا کر آخری درویش یوں قصہ خواں ہوا۔ ''اے جوئندگانِ دانش و درویشی! قدم پایا زمین پر تو عجب رنگ عالم کا دیکھا ہر سُو اک کیفیت طوفانی ہے۔ تونگری مبتلائے ہوس ہے۔ نوازشاتِ شاہانہ بھی انہی کو ہیں جو جامہ سفید زیب تن کیے ہوئے ہیں تو پُرسانِ حال کوئی نہیں۔ تو قیر بچتی ہے تو زندگانی نہیں اور پھر نہ چھیڑ کہ قصہ غریباں کیا ہے ہر چند کہیں ہے کہ نہیں ہیں۔''

خوب پیچ و تاب کھایا، گریہ قیامت کا آیا، فہم یہی پایا کہ حشر ہو وقت محشر سے پہلے فریب ہر سُو ہے، مکر ہر جا ہے، حیوانیت انسانیت پر غالب ہے حق ظلم سے مضروب ہے، جوش دریا کا سا آیا کہ انقلاب ہو، احتساب ہو، حساب ہو، کتاب ہو، سوال ہو، جواب ہو اور جو بھی ہو شتاب ہو، قصد کیا دل میں کہ اب یہی ہو پر کیسے ہو؟ یارانِ غار تو عرصہ ہوا جنس نایاب ہوئے۔ بھلا مرغانِ بادنما سے انقلاب کیوں کر ہو،

آخری درویش نے توقف ایک لمحے کا کیا تو پہلے درویش نے ایک ضمنی سوال کر دیا۔ ''اے پیر درویش اور مرد دانا! مرغان بادنما تو وسیلہ بادنمائی کا ہیں مگر قبلہ نے تذکرہ عجب انداز میں کیا، معاملہ کیا ہے۔''

آخری درویش نے کچھ دیر سر کو ہلایا پر دوسرے درویش کا لہجہ التجائی کمال کا ہوا۔ ''اے مرد دانا! کمترین قصہ میں اشتیاق انتہا کا رکھتا ہے، ہمہ تن گوش ہے، ارشاد ہو کہ اونٹ حوادث کا، واقعات کا کس کروٹ جا بیٹھا؟''

آخری درویش نے دوسرے درویش کے اشتیاق کو یوں انصاف کیا ''گر دل گرفتہ تھا انسانیت کی بے توقیری پر، جستجو تھی حشر کی تو دوسری جانب ایک عجب منظر اور بھی پایا اک گروہ ہے کہ بڑھا چلا آتا تھا، سرگرداں تھا، واسطے مشکل کشائی کے پر چارہ نہ تھا۔ حیران ہوا، پریشان ہوا (پریشان قدرے زیادہ) کہ معاملہ کیا ہے اک آدم زاد سے جو تھامے جگر کو پھرتا تھا، پوچھا کہ تو کون ہے اور ماجرا کیا ہے؟ جواب ملا تعلق اپنا قبیلہ اختیار سے ہے اور اسم گرامی دادا کا ''ابن الوقت'' تھا، گرد سب قریبی ہیں اور پڑے شش و پنج میں ہیں (کچھ ہشت و ہفت میں بھی ہیں) کہ سرکس کے ہما سرداری کا بیٹھے گا۔

بول اس پریشان حال کے سماعت کو سکون ہوئے کہ ٹولہ حاجت مندوں کا ہے ذرا دل دہی ہو تو جماعت مصاحبین کی ہوتی ہے۔ آخری درویش نے قدرے سکوت کیا تو درویشان کو چاشنی میں بدستور ڈوبے پایا۔ بعد یک گونہ طمانیت کے دریائے گفتار کو بار دگرِ رواں دواں کیا۔

کچھ دن کم دو مہینہ ڈوبا اس بحر تذبذب میں کہ راہنما عقل کو کروں تو برآئیں گی دلی مرادیں جو حسرت ہوئی جاتی ہیں۔ نہال ہوں گے ''یارانِ باصفا'' کہ تقاضائے وقت یہی ٹھہرا۔ عدو اس فکر کا اک اور بھی تھا۔ مخلوق خدا جسے ''ضمیر'' کہتی ہے بالمقابل کھڑا ہوا۔ کیا ہوا تیرا جوش کہ دعویٰ انقلاب تھا۔ کہاں ہے تیرا گریہ کہ سیلاب بلا بنا جاتا تھا۔

لا کھڑا کیا دونوں کو کھلے میدان میں کہ فیصل خود کوئی ایک ہو اور تماشائی دونوں کے جدل کا خود ہوا۔ بالآخر میدان ہاتھ عقل کے لگا کہ مروّج صدیوں سے ہے۔ پھر شغل آباء کا بھی یہی ہے۔ کاہے کو منکر ہوتا عافیت جانی، کھیسے اپنے بھرو۔ بس مہابلی سے ڈرو۔ باقی رہے نام۔۔۔

☆☆☆

ظفر اقبال

سمجھ رہے تھے جو آساں، محال ہے اب تک
وہی جواب طلب ہر سوال ہے اب تک

کسی قدر کوئی ہو کر بھی اس قدر نہ رہا
یہاں ہمارا نہ ہونا مثال ہے اب تک

زمانہ ہو گیا، تم بھی نہ لے سکے ہو خبر
اسی طرح کا ہمارا بھی حال ہے اب تک

ہمارے دل میں بہت ٹوٹ پھوٹ رہتی ہے
اگرچہ یوں تو بہت دیکھ بھال ہے اب تک

تمہارے بعد تو گزرا نہیں کوئی، لیکن
یہ سبزہ ہے کہ یونہی پائمال ہے اب تک

تمام شہر سے لے لی ہے صلح تو، لیکن
ہمارے ساتھ ہی جنگ و جدال ہے اب تک

اسی پہ وار ترے روکتا ہوں میں کب سے
یہ میرا جسم نہیں، میری ڈھال ہے اب تک

کچھ اتنی دیر ہمیں یاد رکھ سکے تو بھی
نہ اب ہمیں ہی تمہارا خیال ہے اب تک

خوشی کی لہر تھی آخر وہ کس طرح کی ظفرؔ
تمہارے چہرے پہ گردِ ملال ہے اب تک

☆☆☆

ظفر اقبال

اِدھر اُدھر جو یہ موجود میرا مطلب ہے
تو درمیان سے مفقود میرا طلب ہے

اُسے بھی علم ہے بے کار ہے مرا مقصد
پتا مجھے بھی ہے بیسود میرا مطلب ہے

سدھار اپنا کسی طور ہے مجھے مطلوب
نہ اہلِ شہر کی بہبود میرا مطلب ہے

بہت ہے اس میں عمل دخل میرا اپنا بھی
جو راستے ہوئے مسدود، میرا مطلب ہے

شروع سے ہی جو رختِ سفر نہیں میرے پاس
نہ کوئی منزلِ مقصود میرا مطلب ہے

ہے کوئی شے جو کسی اور چیز میں شامل
اسی طرح سے عنتر بود میرا مطلب ہے

جھلکتا رہتا ہے اس میں لہو بھی لفظوں کا
جہاں تہاں شفق آلود میرا مطلب ہے

جہاں زیادہ مری معنی آفرینی تھی
وہاں وہاں سے ہی نابود میرا مطلب ہے

بیان پھیلا ہوا ہے بہت زیادہ، ظفرؔ
اگرچہ اُتنا ہی محدود میرا مطلب ہے

☆☆☆

ظفر اقبال

ہے اپنے آپ سے انکار، میرا مطلب ہے
جو تیرے ہونے کا اقرار، میرا مطلب ہے

کوئی تو خوابِ خریدار، میرا مطلب ہے
جو ہے یہ گرمیِ بازار، میرا مطلب ہے

نہیں کسی کو سروکار، میرا مطلب ہے
خود اپنے آپ سے بیزار، میرا مطلب ہے

سمجھتا ہوں اسے اتنا زیادہ قابلِ غور
نہ اپنی بات پہ اصرار، میرا مطلب ہے

بس ایک بے طلبی ہے مرے لہو میں رواں
نہیں کسی کا طلب گار، میرا مطلب ہے

ہے منہدم جو عمارت مری عبارت کی
تو اس کے ساتھ ہی مسمار، میرا مطلب ہے

ہے ایک خواریٔ بے انتہا مرا معنی
کوئی خرابیِ بسیار، میرا مطلب ہے

برت رہا ہوں میں الفاظ جتنے صحت مند
اُسی حساب سے بیمار، میرا مطلب ہے

گرا پڑا یہ مرا تکیۂ کلام، ظفرؔ
ہے ایک بسترِ پُرخار، میرا مطلب ہے

☆☆☆

ظفر اقبال

اب بھی ہے اُسی طرح تگ و تاز میں شامل
آواز ہے اپنی تری آواز میں شامل

گل پھول ہیں، کہسار ہیں، جھیلیں ہوں کہ جھرنے
کیا کچھ ہے ترے جلوہ گہِ ناز میں شامل

آہنگ میں آتا ہے ترانہ ترا جس سے
اس طرح کا سُر بھی ہے مرے ساز میں شامل

منزل کی طرف جاتے ہیں کچھ اور بھی رستے
ایک اور جہت بھی ہے اس انداز میں شامل

کھلتا ہوا دیوار میں ہے کوئی دریچہ
ہے ایک دُعا بھی پرِ پرواز میں شامل

اُٹھنے کو بھی ہیں سارے گرائے ہوئے پردے
ہے کشف بھی سمٹا ہوا اِس راز میں شامل

نیت ہے اگر صاف تو ممکن ہے سبھی کچھ
تاثیر بھی ہو سکتی ہے الفاظ میں شامل

میری بھی یہ ناچیز صدا ہے تری خاطر
صد شکر کہ میں بھی اس اعزاز میں شامل

زنجیر جو ٹوٹی تو، ظفرؔ، یہ بھی ہے ممکن
اپنا بھی کرشمہ ہو اس اعجاز میں شامل

ظفر اقبال

ترغیب سے نہ میری تب و تاب سے ہوا
یہ حادثہ کچھ اور اسباب سے ہوا

منظر کٹے پھٹے ، ہوئے یکسو کسی طرح
یہ بھی مرے بکھرتے ہوئے خواب سے ہوا

کچھ فائدہ بھی کھیتیوں کو ہو گیا نصیب
اور کچھ زیاں بھی تند ہی سیلاب سے ہوا

جاری وہ سلسلہ سا اندھیرے کے آر پار
کچھ آفتاب سے نہیں ، مہتاب سے ہوا

سب کر دیا تھا دوسرے ہی خط میں اُس نے صاف
کوئی مغالطہ سا جو القاب سے ہوا

ملتی کہاں سے مجھ کو مرے کُفر کی خبر
یہ بھی گماں دریچۂ محراب سے ہوا

میں ڈوبتا اُبھرتا رہا ، اور سارا کام
گہرائی سے ہوا کبھی پایاب سے ہوا

کچھ میں ہی جانتا ہوں کہ اثنائے راہ میں
جو کچھ مرے تنے ہوئے اعصاب سے ہوا

میرے خلاف جا اُسے بدظن کیا ، ظفرؔ
یہ بھی بجا ہے جو مرے احباب سے ہوا

☆☆☆

ظفر اقبال

کچھ تو خراب صورتِ احوال سے ہوا
کچھ کام اپنی شامتِ اعمال سے ہوا

پہنچا نہیں مدد کو مری ، یہ ہے اور بات
واقف کسی قدر تو مرے حال سے ہوا

اس سے سوا تو سعی تھی میری مرے خلاف
جتنا بھی کچھ تمہارے خدوخال سے ہوا

جب ہم مرے تھے اُس پہ تو وہ بھی تھا ایک دَور
اور عمر کا شمار اُسی سال سے ہوا

لالچ نہیں تھا شہر کے لوگوں میں کچھ ، مگر
آغازِ فتنہ اُس کے زرومال سے ہوا

بس دیکھتے ہی دیکھتے بازی پلٹ گئی
یہ معجزہ بھی اب کے مری چال سے ہوا

پرواز بھی تھی کوئی انوکھی ہی سربسر
کافی ہے جو بھی اپنے پروبال سے ہوا

اس کا سبب کسی کی محبت نہیں ظفرؔ
یہ سب کچھ ایک اور ہی جنجال سے ہوا

ظفر اقبال

جھگڑا نسب سے نہ مرے نام سے ہوا
جو بھی ہوا ، شروع مرے کام سے ہوا

باقی بچا نہ کچھ بھی بتانے کو بزم میں
آغاز اس فسانے کا انجام سے ہوا

پہنچے مکان ہی کے ذریعے مکین تک
کچھ رابطہ جو اپنا دروبام سے ہوا

نقصان ہی تھا اپنا سراسر جو آج تک
خالی تمہارے وصل کے الزام سے ہوا

اب اور بات ہے ، یہاں پہلے تو اپنا کام
جس سے بھی پڑ گیا ، بڑے آرام سے ہوا

ہوتا تھا وہ جو رات گئے کافی دیر بعد
اُس کا بھی انتظار مجھے شام سے ہوا

مجھ پر تو تھا ہی صورتِ حالات کا اثر
کچھ نرم وہ بھی سختیٔ ایام سے ہوا

سیدھا معاملہ جو سمجھ سے رہا ہے دُور
واضح وہ میرے ذہن میں ابہام سے ہوا

کچھ طبع اُس کی اپنی بھی ایسی ہی تھی ظفرؔ
منت سے جو ہوا نہیں ، دُشنام سے ہوا

☆☆☆

ظفر اقبال

کچھ بھی نہ اُس کی زینت و زیبائی سے ہوا
جتنا فساد ہے مری یکتائی سے ہوا

لگتا ہے اتنا وقت مرے ڈوبنے میں کیوں
اندازہ مجھ کو خواب کی گہرائی سے ہوا

لازم تھا جست بھرنے کی خاطر یہ کام بھی
واقف میں اپنے آپ کا پسپائی سے ہوا

کافی تھا یوں تو رنگِ تماشا بذاتِ خود
جو بچ رہا وہ کام تماشائی سے ہوا

میں کس قدر کسی کے شمار و قطار میں
ظاہر وہاں پہ اپنی پذیرائی سے ہوا

کمزوریوں ہماری ہوئیں واشگاف جب
اپنا بھی حشر پوری توانائی سے ہوا

جو اصل چیز تھی وہ چھپی رہ گئی کہیں
کچھ فائدہ نہ حاشیہ آرائی سے ہوا

کھلنا تھا اپنے عیب و ہُنر کا بھرم کہاں
یہ بھی ہوا تو قافیہ پیمائی سے ہوا

ہنگامہ گرم ہے جو مرے چار سُو ظفرؔ
سو بھی ہجوم سے نہیں ، تنہائی سے ہوا

ظفر اقبال

اک ہوا سی کوئی رُکی ہوئی ہے
کبھی چلتی ، کبھی رُکی ہوئی ہے

میرے اُس کے ہے بیچ میں دنیا
اور سب روشنی رُکی ہوئی ہے

راستے ہیں کھلے ہوئے سارے
پھر بھی یہ زندگی رُکی ہوئی ہے

چلتی رُکتی سی دل کی یہ دھڑکن
چل پڑے گی ، ابھی رُکی ہوئی ہے

سلسلہ جو رواں ہے نیکی کا
اس کے پیچھے بدی رُکی ہوئی ہے

آپ ہی چل پڑے گی یہ کسی وقت
یہ گھڑی آپ ہی رُکی ہوئی ہے

بات کیا ہے کہ آج کل اپنی
ساری جادوگری رُکی ہوئی ہے

یہ جو چلتا ہے اختیار اُس کے
درمیاں بے بسی رُکی ہوئی ہے

پسِ گریہ ہے وہ بھی صاف ، ظفؔر
جو ہنسی آپ کی رُکی ہوئی ہے

ظفر اقبال

طلسم سا جو کوئی چار سو رُکا ہوا ہے
رُکا ہوا ہے تماشا کہ تُو رکا ہوا ہے

میں اس کے ساتھ روانہ رہا ہوں دشت بہ دشت
جو ایک خواب مرے رُوبرو رُکا ہوا ہے

یہی وہ آبِ رواں ہے کہ جو مرے آگے
رُکا ہوا بھی ہے اور ہو بہو رُکا ہوا ہے

جو تشنہ کام نہیں وہ بھی کوئی عذر لیے
کسی طرح سے لبِ آبجو رُکا ہوا ہے

گھروں کو اور تو سارے چلے گئے واپس
مگر مرے لیے وہ نرم خو رُکا ہوا ہے

کہیں تھما ہوا ہے کاروانِ باغ و بہار
کہیں وہ مرحلۂ رنگ و بُو رُکا ہوا ہے

کبھی وہ موجِ ملاقات پھر سے ہو آغاز
ابھی وہ سلسلۂ گفتگو رُکا ہوا ہے

عجیب ٹھہرے، ٹھٹھرتے ہوئے زمانے میں
لبوں پہ لفظ ، رگوں میں لہو رُکا ہوا ہے

کلام کرکے وہ جا بھی چکا ہے اور ، ظفؔر
ہجوم خلق ابھی کو بکو رُکا ہوا ہے

☆☆☆

ظفر اقبال

کس طرف سے کوئی راستا رُکا ہوا ہے
بدن روانہ ہے ، رنگِ قبا رُکا ہوا ہے

الگ رُکی ہوئی ہے دیر سے ہوائے چمن
ہجوم ، خوابِ ہوس میں جُدا رُکا ہوا ہے

ہوں فکر مند بھی ، منظر بھی خوب ہے کہ ابھی
ہوا کی لہر پہ سنگِ صدا رُکا ہوا ہے

برس کے کھل بھی گیا اَبر ، اور یہ پانی
اُسی طرح سے یہاں جابجا رُکا ہوا ہے

مزے کی بات ہے یہ بھی کہ رنجِ رفتہ کہیں
مسافری میں ہے ، لیکن ذرا رُکا ہوا ہے

چڑھا ہوا ہے مری زندگی پہ زنگ سا ایک
مری زباں پہ کوئی زہر سا رُکا ہوا ہے

جو لفظ ہے تو لرزتا ہوا سا ہے مجھ میں
اگر لہو ہے تو وہ بھی رُکا رُکا ہوا ہے

جو چل پڑا تو بتا ہی مچائے گا ہر سمت
میں خوش نہیں ہوں کہ سیلِ بلا رُکا ہوا ہے

مرے بھی حصے میں تھا کوئی چل چلاؤ ، ظفؔر
مجھے بتاؤ کہ مجھ میں یہ کیا رُکا ہوا ہے

ظفر اقبال

کھڑی ہے شام کہ خوابِ سفر رُکا ہوا ہے
یقین کیوں نہیں آتا ، اگر رُکا ہوا ہے

گزرنے والے تھے جو بھی ، گزر گئے لیکن
میانِ راہ کوئی بے خبر رُکا ہوا ہے

برس رہا ہے نہ چھٹتا ہے یہ کئی دن سے
جو ایک اَبر مری خاک پر رُکا ہوا ہے

رواں بھی سلسلۂ اشک ہے ابھی کچھ کچھ
یہ قافلہ جو کہیں بیشتر رُکا ہوا ہے

ابھی نکل نہیں سکتا گھروں سے کوئی یہاں
کہ سیلِ آب ابھی دَر بدر رُکا ہوا ہے

ہر ایک شے ہے کسی راکھ میں بدلنے کو
کہیں جو خانۂ خس میں شرر رُکا ہوا ہے

چلی ہوئی مری بات جتنے زروں سے
اُسی حساب سے اُس کا اثر رُکا ہوا ہے

ہر حرف وصوت کرشمے ہیں سب اُسی کے، ظفؔر
لہو کے ساتھ رگوں میں جو ڈر رُکا ہوا ہے

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

سوچتا ہوں پہ کچھ نہیں کھلتا
سبب - اِس روز کی اُداسی کا

بجھ گئے سب دیے اُمیدوں کے
چاند بھی بادلوں میں ڈوب گیا

قہقہوں کی صدائیں آتی ہیں
کوئی بے چارہ ، لُٹ گیا ہوگا

ایک لمحے کی خامشی - اور پھر
کسی دم توڑتے ہوئے کی صدا

میں اُسے کیسے بھول سکتا ہوں
ہائے - وہ ایک نیم وا لمحہ

جھلملاتا ہے دل کے آئنے میں
کوئی (اَن دیکھے خواب کا) چہرہ

جانے کیا گزری بات یاد آئی
جانے کیوں دل - لرز لرز اُٹھا

ہم بھی کچھ عرضِ مدّعا کرتے
کاش ، کوئی ہماری بھی سنتا

بجھتے لمحے ، اُداس جنگل ، رات
اے حبیبؔ ، اِس جگہ کہاں تنہا؟

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

ہر نفس - اپنی ہوا میں رہنا
قہر ہے ، قیدِ انا میں رہنا

نقش ہے پردۂ دل پر کیا کیا
اک نظر - دیدۂ وا میں رہنا

نخلِ وحشت کا سرِ دشتِ طلب
نقشۂ نشو و نما میں رہنا

وائے - آشفتہ سری ، در بدری
کوششِ بے سروپا میں رہنا

زندگی کرنا - بزیرِ افلاک
حجرۂ ہفت بلا میں رہنا

ہم اسیرانِ غزالاں - ہم کو
عمر بھر ، دشتِ خطا میں رہنا

جانے کب وا ہو درِ شہرِ جمال
معتکف ، دل کے حرا میں رہنا

کس قدر خواہشِ عریانی ہے
نکہتِ گُل کا ، صبا میں رہنا

ہر گھڑی - دیکھنا اُس بُت کو حبیبؔ
ہر گھڑی - یادِ خدا میں رہنا

غلام حسین ساجد

عجب سودا سمایا میرے سر میں
ہے کیا اُس گل بدن کی آمد آمد؟
مقابل آ گئی ہے آسماں کے
کہاں جا کر مکمل ہوں گے ہم تم؟
وجودِ غیر کا احساس کیا ہو
رگوں میں دوڑنے پھرنے سے بڑھ کر
جو کچھ میری حفاظت کے لیے تھا
کسی کو حسرتِ تعمیر کیا ہو
ہوس کا رنگ اُڑتا جا رہا ہے
ستارے سو رہیں میری بلا سے
اُترتے ہی نہیں وہ میرے دل سے

سکوں ملتا نہیں اب بحر و بَر میں
عنادل جمع ہیں کیوں میرے گھر میں
زمیں تقسیم ہو کر خشک و تَر میں
کمی باقی ہے کیا نوعِ بشر میں
ابھی تک ہوں میں دستِ کوزہ گر میں
لہو کا رنگ ہے کارِ ہُنر میں
مجسّم ہو گیا میری سِپر میں
نہیں جب فرق کچھ دیوار و دَر میں
کشش کم پڑ گئی کیا سیم و زر میں
رہوں گا صبح ہونے تک سفر میں
عجب اسرار ہے لعل و گہر میں

دکھائی دے کہیں وہ پھول ساجد
پرو لاؤں اُسے تارِ نظر میں

☆☆☆

غلام حسین ساجد

جب کوئی پھول مسخر نہ ہو آسانی سے
کام لیتا ہوں وہاں نقدِ ثنا خوانی سے

روشنی دینے لگے تھے مری آنکھوں کے چراغ
رات تکتا تھا سمندر مجھے حیرانی سے

کر کے دیکھوں گا کسی طرح لہو کی بارش
آتشِ ہجر بجھے گی نہ اگر پانی سے

اُن کو پانے کی تمنا نہیں جاتی دل سے
کیا منور ہیں ستارے مری تابانی سے؟

کوئی مصروف ہے تزئین میں قصرِ دل کی
چوب کاری سے کہیں آئنہ سامانی سے

خاک زادوں سے تعلق نہیں رکھتے کچھ لوگ
میزبانی سے غرض اُن کو نہ مہمانی سے

میں اسی خاک پہ بیٹھا ہوں بڑے شوق کے ساتھ
کوئی نسبت نہیں اب بھی مری سلطانی سے

بند ہو جائے اگر روزنِ امکانِ خیال
خواب کھلتے ہیں مرے دل میں فراوانی سے

میری صورت سے جو بیزار ہیں اب تک ساجدؔ
کب وہ خوش ہوں گے مرے طرزِ مسلمانی سے

☆☆☆

عطاالرحمٰن قاضی

جب نظر آتا ہے گلشن میں صبا کا پیرہن
اوڑھ لیتا ہے دلِ ویراں ہوا کا پیرہن

دیدنی تھی شب ڈھلے آئینہ خانے کی بہار
دفعتاً لَو دے اُٹھا اک خوش ادا کا پیرہن

ہو کبھی یوں بھی کہ مل جائے سرِ راہِ طلب
مدّعا اوڑھے ہوئے حرفِ رسا کا پیرہن

ہم گرفتارِ جنوں ، ہم بادیہ پیمائے شوق
راس کب آیا ہمیں اہلِ ریا کا پیرہن

رات بھر روشن رہے دل کی منڈیروں پر چراغ
رات بھر چمکا ہوا میں اک صدا کا پیرہن

جابجا خواہش کے دھبّے، جابجا حیرت کی دھول
ہے وہی نیرنگیِ ارض و سما کا پیرہن

دُور تک بکھرا ہوا ہوں ، صورتِ ریگِ رواں
تار تار ایسا ہوا اب کے انا کا پیرہن

جسمِ خاکی پر مگر زیبا نہیں لگتا ذرا
یہ تکبر ، یہ بڑائی ہے خدا کا پیرہن

اک فقیرِ خوش نوا و بے غرض مجھ کو عطاؔ
جاتے جاتے دے گیا برگِ دعا کا پیرہن

حفیظ شاہد

یہ زمیں ہے خاک آلودہ عبا پہنے ہوئے
آسماں ہے چاند تاروں کی ضیا پہنے ہوئے

پھول سا معصوم چہرہ ، آنکھ میں شرم و حجاب
خوب لگتے ہو یہ ملبوسِ حیا پہنے ہوئے

کاروانِ زندگی کس راہ پر ہے گامزن
ہر مسافر ہے لبادہ خوف کا پہنے ہوئے

ڈھونڈتے پھرتے ہیں کس بے نام منزل کا نشاں
دشتِ غم میں ہم بگولوں کی قبا پہنے ہوئے

اب اسے بھی اک نئی پوشاک ملنی چاہیے
کب سے ہے دُنیا مری ارض و سما پہنے ہوئے

مائلِ پرواز ہے بابِ اجابت کی طرف
عاجزی کا پیرہن میری دعا پہنے ہوئے

کھوج میں کس کی نکلتا ہے نئے سورج کے ساتھ
ہر نیا دِن اک لباسِ ارتقا پہنے ہوئے

گردشوں میں ہے مسلسل آدمی کے ساتھ ساتھ
یہ زمانہ جامۂ صبح و مسا پہنے ہوئے

کیا خبر شاہدؔ ہمیں ، روزِ ازل سے کس لیے
زندگی اپنے بدن پر ہے قضا پہنے ہوئے

☆☆☆

حفیظ شاہد

پہلے اُس کی یاد آئی اشک آئے بعد میں
جیسے ساون کی گھٹا برسات لائے بعد میں

روشنی اتنی تھی پہلے ، کچھ نظر آتا نہ تھا
کیسے کیسے آنکھ نے منظر دکھائے بعد میں

دیکھنا سورج کہیں جھلسا نہ دے گل کا بدن
پہلے آئے گی چمن میں دھوپ، سائے بعد میں

کھلکھلا اُٹھی ہے دل کی ہر تمنا اس طرح
جیسے بچہ روتے روتے مسکرائے بعد میں

ہو گئی رخصت شبِ غم ، بجھ گئے ماہ و نجوم
میری پلکوں پر ستارے جھلملائے بعد میں

خارزاروں میں سفر کرنا کوئی آساں نہ تھا
جو بہت پُر جوش تھے وہ لوٹ آئے بعد میں

پہلے پچھلے خواب کی تعبیر دیکھے آدمی
اپنی آنکھوں میں نئے سپنے سجائے بعد میں

کس قدر مسرور تھا میں آپ کے ہوتے ہوئے
شومئی قسمت سے کیا کیا غم اُٹھائے بعد میں

جس کو شاہد میں نے بخشا تھا مسافت کا شعور
اُس نے میری راہ میں کانٹے بچھائے بعد میں

حفیظ شاہد

اِس دَور کے ایّام ہیں اب اور طرح کے
درپیش مجھے کام ہیں اب اور طرح کے

الفاظ میں چاہت ہے نہ اوراق معطّر
مکتوب مرے نام ہیں اب اور طرح کے

میخانۂ حالات ہے اب اور طرح کا
گردش میں یہاں جام ہیں اب اور طرح کے

ہم دُوریٔ منزل سے ہراساں نہیں لیکن
خطرات بہرگام ہیں اب اور طرح کے

سیلاب کی صورت ، کبھی آفات کی صورت
اُس ذات کے پیغام ہیں اب اور طرح کے

حیران ہوں، کیا بات ہے، کیوں میری نظر میں
اِس گھر کے دَر و بام ہیں اب اور طرح کے

دیکھیں تو کسی کو بھی دکھائی نہیں دیتے
ہم سب کے لیے دام ہیں اب اور طرح کے

اِس شہر کے اصنام سے ڈرتا ہوں میں شاؔہد
اِس شہر کے اصنام ہیں اب اور طرح کے

حفیظ شاہد

اِس نگر میں یہ کیسی ہوا چل پڑی
میرے گھر کی طرف ہر بلا چل پڑی

تشنہ لب جب شکارِ اجل ہو گیا
جانبِ دشت کالی گھٹا چل پڑی

میں نے دیوار پر روشنی کے لیے
اِک دیا کیا جلایا ، ہوا چل پڑی

بھول بیٹھی ہے دُنیا وفا کا سبق!
یوں زمانے میں رسمِ جفا چل پڑی

کیا کہیں روشنی کا سفر چھوڑ کر
کس ڈگر پہ یہ خلقِ خدا چل پڑی

جب سنا اب مرا آخری سانس ہے
خیر مقدم کو میرے قضا چل پڑی

مل گیا اک نیا ہم سفر جب ہمیں
زندگی اک نیا راستہ چل پڑی

حبس میں خوشبوؤں کو گھِرا دیکھ کر
صحنِ گلشن میں بادِ صبا چل پڑی

میں نے شاؔہد کنارے کو چھوڑا ہی تھا
پھر تعاقب میں موجِ فنا چل پڑی

☆☆☆

حفیظ شاہد

دل پہ ہر گزری ہوئی بات کو مرقوم نہ رکھ
اِس صحیفے کو نئے حرف سے محروم نہ رکھ

بات وہ ہے جو اُتر جائے کسی کے دل میں
اپنے الفاظ کو یوں تشنۂ مفہوم نہ رکھ

اپنی کوتاہیٔ اعمال کو بھی دیکھ ذرا
اپنے ہونٹوں پہ لکھا شکوۂ مقسُوم نہ رکھ

اک نئی صورتِ حالات بنا اپنے لیے
خود کو اِس دہر کے حالات کا محکوم نہ رکھ

اپنے احساس کا ہر نقش ہو تجھ پر واضح
دل کے شیشے میں کوئی پیکرِ موہوم نہ رکھ

تیری سوچوں کی طہارت کے لیے لازم ہے
آنکھ کو اشکِ غمِ ذات سے محروم نہ رکھ

وقتِ آیندہ کا احساس بھی کر لے شاؔہد
ہر گھڑی پیشِ نظر ماضیٔ مرحوم نہ رکھ

حفیظ شاہد

جب سے ملی ہے دولتِ احساس اور بھی
آنے لگی حیات مجھے راس اور بھی

کیسی عجیب بات ہے دریا کے آس پاس
محسوس ہو رہی ہے مجھے پیاس اور بھی

ایندھن غموں کا دل کو ہوا اور دستیاب
بھڑکے گی اب تو آتشِ احساس اور بھی

جلنے لگے ہیں دل میں تری یاد کے چراغ
روشن ہوئی ہے بزمِ غم و یاس اور بھی

تاراجیٔ بہارِ چمن دیکھتے ہوئے
مغموم کیوں نہ ہو دلِ حسّاس اور بھی

مایوسیوں نے مجھ کو ہراساں نہیں کیا
چمکی ہے ظلمتوں میں مری آس اور بھی

شاؔہد کسی کے دستِ حنائی میں دیکھ کر
اچھّی لگی گلاب کی بُو باس اور بھی

☆☆☆

خاور اعجاز

ٹوٹا ہوا ہے پُل افقِ بے کنار کا
شاید یہ مرحلہ ہے ترے انتظار کا

گردش میں آ رہے ہیں در و بامِ زندگی
گرنے کو ہے ستون مرے اختیار کا

جھونکا ہوا کا آیا ہے لینے چراغ کو
حافظ ہے حبسِ دم ہی دلِ بے قرار کا

بہتا ہے اک فراتِ مہ و سال اَب وہاں
ٹھہرا جہاں پہ قافلہ لیل و نہار کا

دورِ خزاں سے گزرے تو معلوم یہ ہوا
اب تا ابد رہے گا یہ موسم بہار کا

☆☆☆

خاور اعجاز

اس شرط پہ منظور زیاں ہے ہمیں جاں کا
صیّاد وہیں کا ہو پرندہ ہے جہاں کا

مجھ سے بھی چمن زارِ زمانہ میں ہے رونق
کہنے کو میں سوکھا ہوا پتّا ہوں خزاں کا

ملتا نہیں اس قصّۂ ہستی کا سِرا ہی
اک حرف یہاں کا ہے تو اِک حرف وہاں کا

آنکھیں نہیں کھلتیں کئی صدیوں کے سفر میں
ہلکا سا اثر بھی ہو اگر خوابِ گراں کا

کہتے ہو غزل میں نہیں کچھ ذائقہ ایسا
اور ساتھ مزہ بھی لیے جاتے ہو زباں کا

خاور اعجاز

طول کیا دینا اُنہیں اِس قصّۂ کوتاہ کا
پھول ہے جن کے لیے کانٹا تمہاری راہ کا

سب نے دیکھا ایک آنسو آنکھ سے ڈھلکا ہوا
کس نے دیکھا رائگاں جانا ہماری آہ کا

ہم ہی جانے ہیں نگاہِ یارِ کم آمیز کو
ہم سے پوچھو دیکھنا اُس چشمِ بے پرواہ کا

امن کے بارے میں کتنے پوسٹر چسپاں مگر
پھیلتا جاتا ہے زہر اِک زیرِ لب افواہ کا

کوچۂ عشّاق میں بیٹھے ہیں ہم دھونی رمائے
آفتاب اک ذرّۂ روشن ہے اِس درگاہ کا

خاور اعجاز

ایک عالم میں ہوا چرچا جو رسوائی کا
شوق تو پورا ہوا انجمن آرائی کا

عقل کی ڈور تو سو مرتبہ ٹوٹی لیکن
عشق نے جوڑ دیا سلسلہ سودائی کا

رہ گئی بات کوئی اُس کے لبوں پہ آ کر
ریت سے بھر گیا منہ لالۂ صحرائی کا

ہم پہ عقدہ یہ کھلا بیٹھ کے اک مجلس میں
درد سے رشتہ ہے کیا عالمِ تنہائی کا

اصل قصہ ہی نہ ہو قابلِ شنوائی تو
فائدہ کوئی نہیں حاشیہ آرائی کا

☆☆☆

خاور اعجاز

اُٹھاتا ہے مزہ خود آسماں سے ہم کناری کا
ہمیں سونپا ہوا ہے کام بس اختر شماری کا

عجب انداز ہے غالبؔ تری منظر نگاری کا
''چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا''

رضامندی پہ کیوں محمول کرتا ہے اسے یارب
ہماری چپ تو اک انداز ہے شکوہ گزاری کا

زمینِ شوق سے چنتا ہے وہ ٹوٹے ہوئے تارے
ہر اک ذرّہ یہاں پر منتظر ہے اپنی باری کا

ہمیں یہ ہجر جو لاحق ہوا ہے زندگی بھر کو
ہمارا شوق تو پورا ہوا اُمیدواری کا

چراغِ راہ سے لے کر چراغِ خانۂ دل تک
سبھی کو مرحلہ درپیش ہے بے اختیاری کا

تمہیں بھی کچھ یقین آیا گمانِ زندگی پر کیا
ہمیں تو اعتبار آیا فقط بے اعتباری کا

فلک پر ٹانکتا جاتا ہے کوئی میرا ہر آنسو
اثر ہونے لگا ہے اُس پہ میری آہ و زاری کا

ہماری خاک ساری بستیوں میں اُڑتی پھرتی ہے
ہمارے منہ پہ ہی سجتا ہے دعویٰ خاکساری کا

کبھی کھلتا تھا ہم پر بھی درِ حیرت فزا اُس کا
کبھی دیوارِ جاں میں باب تھا اک بے قراری کا

زمین و آسماں جب بھر گئے اُس کی تجلی سے
تو آگے بڑھ گیا رہوار اُس کی بے کناری کا

اُسی کے پاس ہے ذوقِ نظر بھی اور تماشا بھی
فلک کی آنکھ سے سیکھو ہنر آئینہ داری کا

☆☆☆

صابر عظیم آبادی

ٹھہروں کہاں میں مرکز و محور کو چھوڑ کر
جاتا نہیں ہے دریا سمندر کو چھوڑ کر

جس گھر سے پھوٹتی تھی محبت کی روشنی
پچھتا رہا ہوں آج اُسی گھر کو چھوڑ کر

چہرہ ہے زخم زخم بدن ہے لہو لہو
میں سو گیا تھا کانٹوں پہ بستر کو چھوڑ کر

اس شہرِ رنگ و بُو سے غمِ زندگی لیے
میں جا رہا ہوں اپنے مقدر کو چھوڑ کر

یہ کون شخص ہے جو عداوت کے باوجود
پتھراؤ کر رہا ہے مرے سر کو چھوڑ کر

آتی نہیں ٹھکانے کی صورت نظر کوئی
بے حد ہوا ملال ترے در کو چھوڑ کر

صابر ملا ہے مجھ کو کئی ہجرتوں کا کرب
جاؤں کہاں میں شہرِ سمندر کو چھوڑ کر

صابر عظیم آبادی

نہیں اچھا ذلیل و خوار ہونا
کسی سے بر سرِ پیکار ہونا

تمہارے راستے کی کہکشاں میں
نہیں میں چاہتا دیوار ہونا

چلو ہم فیصلہ کر لیں گے گھر میں
تماشا کیا سرِ بازار ہونا

رہا انسان کی فطرت میں شامل
اسیرِ عارض و رخسار ہونا

شرافت بیچنا اچھا نہیں ہے
ہمیشہ آئینہ کردار ہونا

جہادِ زندگانی میں جیالو
کبھی خنجر کبھی تلوار ہونا

عداوت کی جہاں ہے دھوپ صابرؔ
وہاں تم سایۂ دیوار ہونا

☆☆☆

حصیر نوری

بھروسہ ہم کریں کیونکر کسی پر
ہزاروں تہمتیں ہیں زندگی پر

یہ میرا ظرف ہے کہ دشمنوں کو
سدا ترجیح دی ہے دوستی پر

غموں کی دھوپ احساسِ تغیر
مسلط ہو گئے ہیں آدمی پر

وہاں لایا ہے مجھ کو خواب میرا
جہاں روتا ہے انساں بے بسی پر

دِل بیتاب کی حالت نہ پوچھو
یہ ہر لمحہ دھڑکتا ہے خوشی پر

مجھے حیرت رہے گی زندگی بھر
مرے ہمدرد تیری بے رُخی پر

ابھی تک اُلجھنوں میں مبتلا ہوں
قناعت کر رہا ہوں خامشی پر

حصیؔر ان کو نمائش سے غرض ہے
میں مرتا ہوں ہمیشہ سادگی

☆☆☆

حصیر نوری

موسم گل میں نہ در در ہوتا
رشکِ صحرا جو میرا گھر ہوتا

بانٹ لیتا جو میرا دکھ کوئی
بوجھ ایسا تو نہ دل پر ہوتا

اس کا سر چشم زدن میں کٹتا
جو ترے سر کے برابر ہوتا

اپنی وسعت پہ مجھے ہوتا ناز
کاش یہ دل بھی سمندر ہوتا

دستِ آذر سے گزر جاتا تو
وہ خدا ہوتا نہ پتھر ہوتا

ہاتھ خالی مرا ہوتا تو پھر
وقت کے ہاتھ میں خنجر ہوتا

سرگراں میں نہ اگر ہوتا حصیؔر
میں نہ اس درجہ سبک سر ہوتا

مشتاق شبنم

حسن جب میرے روبرو ہی نہیں
کوئی موضوعِ گفتگو ہی نہیں

میرے حق میں ہزار ہا ہیں ستم
آپ کی چشمِ حیا جو ہی نہیں

کاش ان منزلوں میں ہم ہوتے
جس جگہ فرقِ ما و تو ہی نہیں

اک تسلسل ہے زخم تازہ کا
جبکہ میرا کوئی عدو ہی نہیں

خود فریبی سی خود فریبی ہے
کوئی معیار رو برو ہی نہیں

دور کیسا یہ آ گیا شبنمؔ
کج کلاہوں کی آبرو ہی نہیں

مشتاق شبنم

دل کا خوں ہے پلک پلک دیکھو
بات پہنچی کہاں تلک دیکھو

آج کے دور سے نمایاں ہے
آؤ آئندہ کی جھلک دیکھو

آج کا دکھ اگر سمجھنا ہے
زخم پر رکھ کے کچھ نمک دیکھو

کل بھی تھی گفتگوئے حق مشکل
آج بھی ہے وہی جھجک دیکھو

لوگ بستے ہیں کس خلاؤں میں
اس زمیں پر نہیں فلک دیکھو

ہے برے وقت میں تمہیں اپنے
ان کے دل میں پڑا ہے شک دیکھو

حادثہ ہو نہ رونما کوئی
ان کی آنکھوں میں ہے چمک دیکھو

☆☆☆

اکرم عتیق

نیا ٹھکانہ بجھائی دے ہر مقام کے ساتھ
سفر ہے باندھ کے رکھا ہوا قیام کے ساتھ

اسیرِ پا بھی ہے، اٹھکیلیاں بھی کرتی ہے
عجیب رشتہ ہے خوشبو کا اس کے گام کے ساتھ

ہر ایک بات حسیں، ایک ایک لفظ میں رنگ
وہ ہم کلام ہے جب سے مرے کلام کے ساتھ

گِلے ہزار ہوں لیکن وہ جب نظر آئے
تو دیکھتی ہے نظر اس کو احترام کے ساتھ

اب اس سے بڑھ کے کرم مہربان کیا کرتا
کہ زہر بھیجا ہے اس نے مجھے سلام کے ساتھ

شکار کا ہے کوئی دام یا فریبِ دام
الجھ پڑا ہے جو صیّاد اپنے دام کے ساتھ

شمار کرتا ہے ہم کو وہ عام لوگوں میں
یہ اور بات کہ ملتا ہے اہتمام کے ساتھ

ہمارے کارِ محبت پہ معترض تھا جو
اسے بھی پیار تھا کچھ کچھ ہمارے کام کے ساتھ

ہمیں مثال ہوئے عاجزی کی اور عتیقؔ
انا کا نام ہے زندہ ہمارے نام کے ساتھ

☆☆☆

اکرم عتیق

وہ مجھے دیکھ کے یوں بات بدل جاتا ہے
گرتے گرتے کوئی جس طرح سنبھل جاتا ہے

حسن افسردہ ہو، چنچل ہو کہ سنجیدہ ہو
یہ وہ جادو ہے جو ہر حال میں چل جاتا ہے

بات کیا دل کی کریں، دل کی کریں بات ہی کیا
کبھی خوش ہے تو کبھی درد میں ڈھل جاتا ہے

میرے ہی نام کی سیڑھی سے بلندی پہ گیا
وہ جو اک شخص مرے نام سے جل جاتا ہے

جانے کیا خوف ہے اس کو کہ مجھے دیکھتے ہی
کبھی خنجر، کبھی تلوار میں ڈھل جاتا ہے

کسی پتھر کا کوئی سانحہ کیا کر لے گا
دل اگر دل ہو تو باتوں سے پگھل جاتا ہے

رات کے ہاتھ میں تنہائی ہو، تاریکی ہو
دل تری یاد کے جگنو سے بہل جاتا ہے

تیری محفل سے کبھی یوں بھی ہوا ہوں رخصت
جیسے پنچھی درِ زنداں سے نکل جاتا ہے

درگزر کرنا ہے شامل مری فطرت میں عتیقؔ
مجھ سے دشمن مرا بے وجہ دہل جاتا ہے

اوصاف نقوی

ایوانِ شش جہات امارت ہے سانس کی
دنیائے آب و گل میں شرارت ہے سانس کی

کس شوق سے قضا اسے پڑھنے میں غرق ہے
مکتوبِ زندگی پہ عبارت ہے سانس کی

کیا بات ہے کہ اربع عناصر بجھارت ہے
حالانکہ سیدھی سادھی بجھارت ہے سانس کی

شامہ کی حس وجود کے باطن سے کہہ گئی
ہر دم ہوا سے ملنا زیارت ہے سانس کی

اوصافؔ صرف خاک کا پیکر نہیں بشر
جب جسم زندگی میں حرارت ہے سانس کی

اوصاف نقوی

جو زمان و مکاں کے قیدی ہیں
وہی سود و زیاں کے قیدی ہیں

زلفِ دنیا کے ہم اسیر نہیں!
حسن کے آستاں کے قیدی ہیں

ہر گھڑی ہے دلیل قدرت کی
ہر گھڑی امتحاں کے قیدی ہیں

معنی صبحِ ازل سے ہیں آزاد
حرف سارے زباں کے قیدی ہیں

ابتدا کی نہ انتہا کی خبر!
ہم تو بس درمیاں کے قیدی ہیں

اپنی قسمت ہے اپنے ماتھے پر
ہم کسی داستاں کے قیدی ہیں

ہم میں اوصاف کیا ہمارا ہے
صرف نام و نشاں کے قیدی ہیں

☆☆☆

اوصاف نقوی

زینتِ چشمِ یار ہیں آنسو
منظروں کا نکھار ہیں آنسو

مسکرائیں تو لوٹ لیتے ہیں
کیسے تخریب کار ہیں آنسو

شبنمی چشم کی غزل خوانی
در دُرت کا وقار ہیں آنسو

نور کی ہے کرن کرن ان میں
ایک مفلس کا پیار ہیں آنسو

جھوم اُٹھے ہیں کیوں سرِ مژگاں
کیا کسی کی پکار ہیں آنسو

خشک اوصافؔ آنکھ ہے کب سے
کس کے امیدوار ہیں آنسو

☆☆☆

اوصاف نقوی

زندگی کے قریب خاموشی
سب سے بڑھ کر خطیب خاموشی

آرزو ، انتقال کرتی ہے
بول اب بد نصیب خاموشی!

معرفت نفس کی عطا کر دی
کس قدر ہے ادیب خاموشی

فصلِ گل جا چکا ہے گلشن سے
سیکھ اب عندلیب خاموشی

مصلحت آشنا ہوئی جب سے
اَب کہاں ہے غریب خاموشی

سرِ فطرت کے ہونٹ پر اوصاف
آج تک ہے عجیب خاموشی

پرویز ساحر

اپنی متاعِ صبر سے بارے نہیں گئے ہم
اُس سے بچھڑ کے حوصلہ ہارے نہیں گئے ہم

مدت ہوئی کہ طَوفِ حرم بھی کیا نہ ہم نے
مدت ہوئی کہ یار کے دوارے نہیں گئے ہم

کچھ تو ضرور تھا کہ ہم اُس پر فدا ہوئے ہیں
یوں ہی تو اپنی جان سے پیارے نہیں گئے ہم

ہم نے تو زندگی کو گزارا ہے خوش دلی سے
یعنی کہ صرف دن ہی گزارے نہیں گئے ہم

شاید اسی لیے نہیں کھل پائے ہم جہاں میں
اپنے سوا کسی پہ اُتارے نہیں گئے ہم

سختی کشانِ عشق میں نام آ سکا نہ ساحرؔ
افسوس راہِ عشق میں مارے نہیں گئے ہم

پرویز ساحر

تری قسم ، اے مری جانِ آرزو ! تری یاد
بہت رُلاتی ہے مجھ کو کبھو کبھو تری یاد

یہی سلوک و رویّہ رہا اگر اِس کا
نچوڑ ڈالے گی اِک دن مرا لہو تری یاد

کوئی بھی بزم ترے ذکر سے نہیں خالی
ہر ایک شخص کا موضوعِ گفتگو تری یاد

مثالِ آہوئے آوارہ ، ایک مدت سے
بھٹکتی پھرتی ہے اِس دل میں سُو بہ سُو تری یاد

ترے علاوہ بھلا اور کون ہے اپنا
مرا شریکِ الم ہے بس ایک تُو ، تری یاد

اگر میں چاہوں بھی ساحرؔ تو بھُول سکتا نہیں
کچھ اِس طرح سے ہے میرے چہار سُو تری یاد

☆☆☆

نبیل احمد نبیل

یہ اور بات جڑیں اپنی خاکداں تک ہیں
ہماری سوچ کی شاخیں تو آسماں تک ہیں

نفس نفس مرا مثلِ یقیں تو ہے ، لیکن
مرے وجود کی پہنائیاں گماں تک ہیں

ہمارے بعد خدا جانے کیسا منظر ہو
ہم آفتاب ہیں اور شام کی اذاں تک ہیں

تمہارے شہر سے اک دن گزر کے دیکھیں گے
یہ رنگ و نُور کے موسم بھلا کہاں تک ہیں

مرا نصیب ہے صحرا کی دھوپ میں جلنا
تمہاری بزم کے سائے تو سائباں تک ہیں

یہ اور بات پلٹنا ہے ہم کو گھر کی طرف
تمہارے ساتھ مگر آخری نشاں تک ہیں

تمہارے چہرے کی مانند صاف شیشۂ دل
شکایتیں ہیں جو تم سے فقط زباں تک ہیں

نبیل احمد نبیل

راکھ سے کوئی ستارہ نہ بنانا پڑ جائے
پھر اسے لوحِ مقدر سے مٹانا پڑ جائے

ماننا پڑتی ہے ہر بات زمانے والی
درمیاں کوئی اگر دوست پرانا پڑ جائے

یہ بھی ہوسکتا ہے مٹّی مجھے ٹکنے ہی نہ دے
یہ بھی ممکن ہے فلک سے مجھے آنا پڑ جائے

یہ بھی ہوسکتا ہے خود سے بھی بچھڑ جاؤں میں
یہ بھی ممکن ہے مجھے تجھ کو گنوانا پڑ جائے

ہم نے اس ترکِ تعلق پہ نہ سوچا اتنا
ایک دوجے سے اگر ہاتھ ملانا پڑ جائے

اب تری سمت نہ آؤں گا کبھی لوٹ کے میں
چاہے قدموں میں مرے سارا زمانہ پڑ جائے

یہ بھی ہوسکتا ہے ہو جائے ہواؤں کا نزول
یہ بھی ممکن ہے کوئی دیپ جلانا پڑ جائے

میں نے سوچا تھا کہ احسان زمیں کا نہ اُٹھاؤں
اور رستے میں اگر کوئی خزانہ پڑ جائے

☆☆☆

نبیل احمد نبیل

اُس نے پیشانی پہ کیا دستِ شفا رکھا ہے
شہر کے شہر نے اک حشر اُٹھا رکھا ہے

دل دھڑکتا ہے تو بس تیرے لیے ہی ورنہ
خاک کا ڈھیر ہوں اور خاک میں کیا رکھا ہے

توڑ دیتے ہو مرے دل کو کبھی جوڑتے ہو
تم نے تو پیار کو اِک کھیل بنا رکھا ہے

خواہشیں بڑھتی ہیں بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں
کس نے انسان کو یہ روگ لگا رکھا ہے

آندھیاں ایسی اُٹھیں بجھ گئے سورج ، لیکن
اک دیا ہم نے بہرطور جلا رکھا ہے

نبیل احمد نبیل

کہیں پہ اشک ، کہیں چشمِ تر بناتا ہوں
میں اپنی موج میں رہ کر بھنور بناتا ہوں

یہی حوالہ مرا معتبر حوالہ ہے
میں سارے کام ترے نام پر بناتا ہوں

بگاڑ لیتا ہے میرے تمام خال و خد
وہ آئنہ میں جسے توڑ کر بناتا ہوں

مہکنے لگتا ہے آنگن عجیب خوشبو سے
فصیل پر تری تصویر اگر بناتا ہوں

رہِ حیات کے جلتے ہوئے سفر میں نبیلؔ
میں اپنے جسم کو اکثر شجر بناتا ہوں

☆☆☆

حروفِ زر

(قارئین کے خطوط)

''انگارے'' کے چوتھے سال کی تیسری کتاب سامنے ہے۔''چند باتیں'' میں حبیب جالب کے مبنی بر صداقت ذکر کے بعد آج کے سرکاری، درباری اور کاروباری شاعروں کا بیان حقیقت پسندانہ دلچسپ پیرائے میں کیا گیا ہے۔ کیا سچا اور خوب صورت جملہ ہے: ''سوئے ہوئے ضمیروں کے ساتھ مردہ لفظوں کی تجارت آج کی شاعری کا اہم حوالہ ہے۔'' اس جملے کے تناظر میں مشاعروں کے ذریعے شہرت اور پیسہ کمانے والی آج کی مخلوق یا شاعری پر بھی نظر جا پڑتی ہے کہ جس میں پھکڑ پن کو مزاح کے نام پر پیش کیا جا رہا ہے۔ حقیقی مزاح کے پس پردہ جو دردمندی اور ہمدردانہ سنجیدگی چھپی ہوتی ہے اسے یہ شاعری دُور سے چھوڑ دیتی ہے اور اس کے پیچھے سوائے ہاتھوں کے الٹے سیدھے اشاروں اور چہرے کے ٹیڑھے میڑھے زاویوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔

ڈاکٹر محمد امین نے استاد مکرم پروفیسر اصغر علی شاہ کی شخصیت کے متنوع علمی، ادبی و لسانی پہلوؤں کو بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ بہ احسن اجاگر کیا ہے۔ اپنے مضمون میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ ''بحرالفصاحت'' کا انداز بیان پرانا ہونے کے باعث آسان مروّجہ اُردو میں عروض کی کتاب کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے تو ''بحرالفصاحت'' لاہور سے آسان مروّجہ اُردو میں شائع ہو چکی ہے۔ اس موضوع پر دیگر معیاری کتابیں جو آسانی سے دستیاب ہیں ایک تو یاس یگانہ کی ''چراغ سخن'' ہے جو لکھنؤ کے علاوہ لاہور سے بھی چھپ چکی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر گیان چند کی ''اُردو کا اپنا عروض'' دلی کے بعد لاہور سے بھی شائع ہو چکی ہے۔ آغا صادق کی ''جوہر عروض'' کے علاوہ خاص طور پر صغیر احمد جان کی ''صحیفۂ فنون ادب'' علم عروض پر آسان اور نہایت معیاری کتاب ہے لیکن موخرالذکر دونوں کتب آسانی سے دستیاب نہیں البتہ اچھی لائبریریوں سے مل سکتی ہیں۔

تنویر ساغر نے ژونگ کے بارے میں چند فکری تحفظات کا جائزہ اختصار و جامعیت سے لیا ہے۔ دروں بیں اور بروں بیں کی بحث کو سی اے قادر کے خیالات کا حوالہ مزید دلچسپ بنا دیتا ہے۔ میرے خیال میں یہ دونوں خصائص بیک وقت شخصیت میں موجود ہوتے ہیں لیکن نسبت تناسب کے باعث ہم یہ کہیں گے کہ بروں بیں شخصیت کا فکری سفر خارج سے داخل اور داخل سے پھر خارج کی سمت ہوتا ہے جب کہ دروں بیں شخصیت کا فکری سفر داخل سے خارج اور خارج سے پھر داخل کی سمت ہوتا ہے۔ فکری سفر کی حسب ذیل صورت کے تحت ہم بروں بیں اور دروں بیں شخصیت کا تعین کر سکتے ہیں۔

خارج --> داخل --> خارج = بروں بیں

داخل --> خارج --> داخل = دروں بیں

عابد میر کی کہانی ''عطیہ'' کا انجام تو چشم کشا ہے ہی، آغاز بھی بڑا بصیرت افروز ہے۔ یہ آغاز ہمارے ہاں کے ایک وسیع حلقے کے ایک گمراہ کن عقیدے کی طرف یوں متوجہ کرتا ہے کہ چشم تصور تیرہویں صدی عیسوی کے ایک واقعے کی طرف پلٹ جاتی ہے جب خلیفہ مستعصم باللہ کے دَور میں ہلاکو خان نے بغداد فتح کیا اور محل کے ایک کمرے میں نظر دوڑاتے ہوئے کہا:

> ''آپ نے ان صندوقوں کے فولاد سے اپنی فوج کے لیے تیروں کے سوفار کیوں نہ بنوائے اور یہ تمام سونا و جواہرات اپنے سپاہیوں میں تقسیم کیوں نہ کیا اور آپ نے پہاڑوں کے دامن میں باہر نکل کر مجھے پہلے سے روکنے اور مقابلے کی کوشش کیوں نہ کی؟ خلیفہ نے بے بسی کے عالم میں جواب دیا ''مشیت ایزدی یہی تھی۔'' تاتاریوں کے سپہ سالار نے کہا ''اچھا تو اب ہم جو سلوک آپ سے کریں اسے بھی مشیت الٰہی سمجھنا۔'' اس کے بعد ہلاکو نے جو سلوک خلیفہ مستعصم باللہ اور بغداد کے شہر سے کیا آج بھی محض خیال آنے سے لرزہ طاری ہوتا ہے۔ خلیفہ اور اس کے بیٹوں کو نمدے میں زندہ لپیٹ کر نمدے کو سی لیا گیا اور پھر خونخوار تاتاری سپاہیوں نے اس نمدے پر گھوڑے دوڑائے۔''
>
> (''سقوطِ بغداد سے سقوطِ ڈھاکہ تک'' از میاں محمد افضل، ص ۲۱)

زیر نظر شمارے میں آپ نے نہ صرف ظفر اقبال کے لیے گوشہ محفوظ کیا ہے بلکہ ظفر اقبال نمبر شائع کرنے کا بھی اعلان کیا ہے۔ بلاشبہ ظفر اقبال نے اپنی کئی غزلوں میں بہت اعلیٰ اشعار پیش کیے ہیں لیکن یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ جتنے بڑے شاعر ہیں اس سے کہیں زیادہ بڑے نفسیات دان ہیں۔ جذباتی لوگوں کے خطے پاک و ہند میں ناقدین اور شعرا کی نفسیات سے کامیابی کے ساتھ کھیلتے ہوئے انہوں نے موافقت براستہ مخالفت کا سفر بڑی خوش اُسلوبی سے طے کیا ہے۔ اب وہ اس مقام پر ہیں کہ جو چاہیں لکھیں، الفاظ کی صورتوں اور تلفظ کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں، سب مثبت تصور ہوگا۔ اب انہیں اپنے کہے میں سے انتخاب کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یقیناً وہ تحسین کے حق دار ہیں اور ان سے بھی زیادہ داد کے مستحق وہ تلاشیے ہیں جو وقت کی نبض پر ہاتھ رکھے اپنی انگلیاں گن رہے ہیں۔

(اکرم عتیق۔ وہاڑی)

''انگارے'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ مضامینِ نظم و نثر میں ''پروفیسر اصغر علی شاہ کے چہار مقالہ'' پر ڈاکٹر محمد امین کا مضمون اعترافِ عظمت کی عمدہ مثال ہے۔ ظفر اقبال کا گوشہ خاصے کی چیز ہے۔ پروفیسر مزمل حسین نے مشرقی تنقید کی یاد تازہ کی ہے مگر اس نوع کی مشقت کھینچنے کا فائدہ کیا؟ یہ سبھی صنائع بدائع تو احمد صغیر صدیقی کی شاعری میں بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ حالاں کہ چہ نسبت۔۔۔

''حروفِ زر'' میں احمد صغیر صدیقی کا خط پڑھ کر بہت مزہ آیا اور اس سے بھی زیادہ اس بات سے کہ وہ میرے پانچ برس پرانے ایک مضمون میں اپنا نام موجود نہ ہونے کی خوشی اب تک منا رہے ہیں۔ انہیں نوید ہو کہ دو ایک روز میں اُن کی یہ خوشی دو چند ہونے کو ہے۔ کیونکہ ''آئندہ'' کے آنے والے شمارے میں میرا ایک مضمون ''اُردو غزل پاکستان میں'' شائع ہو رہا ہے اور اُن کا ذکرِ خیر اس مضمون میں بھی راہ نہیں پا سکا۔ صرف وہی نہیں، ہم عصر جدید شعرا کی جگالی کرنے والے اُن جیسے کسی بھی شاعر کا نام اس مضمون میں موجود نہیں کیوں کہ اساطیری غزل کے شعرا کے مقابلے میں اُن کی حیثیت وہی ہے جو اقبال کے مقابلے میں امین حزیں سیالکوٹی کی تھی۔

(غلام حسین ساجد۔ لاہور)

''انگارے'' کے تازہ شمارے میں گوشۂ ظفر اقبال دیکھ کر ایک گونہ سرخوشی ہوئی، معاصر ادب کی تفہیم میں ''انگارے'' کا کردار واقعی قابلِ صد ستائش ہے۔ احمد صغیر صدیقی صاحب کی دلچسپ نثر (خط) پڑھ کر زبان چٹخارے بھرنے لگتی ہے۔ ان کی غزل بھی خوب صورت ہے، غزل کا ایک شعر ہے

ایک لمحے میں کتنی صدیاں کبھی
کبھی صدیوں میں ایک لمحہ نہیں

مذکورہ بالا شعر پڑھتے ہوئے محبوب خزاں کا یہ شعر بے اختیار حافظے میں در آیا

کبھی ہر سانس میں زمان و مکاں
کبھی برسوں میں ایک لمحہ نہیں

آخر میں ایک بات یہ کہ ضرورتِ شعری کا جواز واقعی بن جاتا ہے اگر شعر غیر معمولی کیفیت، موضوع یا طرزِ اظہار کا حامل ہو لیکن عجزِ بیان کو ضرورتِ شعری کی بیساکھی کیا واقعی سہارا دے سکتی ہے، اربابِ دانش کو اس پر بھی غور کرنا چاہیے۔

(عطاالرحمٰن قاضی۔ عارف والا)

''انگارے'' کا شمارہ نمبر ۳۹ موصول ہوا اور ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی آپ نے قارئین کو سنجیدہ اور معیاری ادب پڑھنے کو دیا۔ ''انگارے'' کی خاص بات یہ ہے کہ ''تخلیق'' کی طرح اس کا اداریہ بھی ہر مرتبہ ادب کے کسی سلگتے ہوئے مسئلے کی نشان دہی کرتا ہے، معاصرین کی طرح آپ اسے ''ادب پرور'' شخصیات کے لیے اظہارِ تشکر اور رفتگاں کے لیے اظہارِ تعزیت تک محدود نہیں رکھتے۔ اس شمارے میں آپ نے ایک اہم سوال اُٹھایا کہ آج کے ادیب کی فکری اور نظریاتی وابستگی کیوں ختم ہوتی جا رہی ہے؟ حبیب جالب کو یاد کرتے ہوئے آپ نے ادیبوں کے ان بہت سے رویوں کا ذکر کیا کہ جن پر اب کسی کو حیرت ہی نہیں ہوتی کہ سرکار کی خوشامد تو معمولات میں شامل ہوتی جا رہی ہے۔ ادیب کی نظریاتی وابستگی

کے خاتمے میں ہماری دانست میں اُن این جی اوز (NGOs) نے بھی بنیادی کردار ادا کیا جو روشن خیالی اور انسانی حقوق کے تحفظ کے نام پر پیسہ کما رہی ہیں اور دانشوروں کو کرپشن سے آشنا کر رہی ہیں۔ بہت سے نظریاتی ادیب جن کو ہم اپنا آئیڈیل سمجھتے تھے پُرکشش تنخواہوں پر ان این جی اوز کی پناہ میں چلے گئے۔ اب انہیں ان کے لکھے کا معاوضہ ملتا ہے، وہ ہوائی جہازوں پر سفر اور پانچ ستارہ ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں، جن کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں۔ سو میرے بھائی کہاں کے نظریات اور کیسی مزاحمت، یہاں تو لوگ ایک انٹیلی جنس افسر کے ٹیلی فون کی مار ہوتے ہیں۔ خود کو ترقی پسند ظاہر کرنے والوں کے پاس بہت سے چولے ہوتے ہیں جو وہ موقع کی مناسبت سے تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ایک محفل میں جو ترقی پسند بنے ہوتے ہیں، چند قدم کے فاصلے پر دوسری محفل میں ان کی گفتگو سنیں تو ان سے بڑا رجعت پسند کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔

زیرِ نظر شمارے میں پروفیسر اصغر علی شاہ کے چہار مقالے ڈاکٹر محمد امین اور ژونگ کے فکری تحفظات پر تنویر صاغر کے مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر تو ظفر اقبال کا گوشہ ہے کہ جس میں آپ نے اس منفرد غزل گو کی ۲۶ غزلیں ایک ہی نشست میں مہیا کر دیں۔ ۸۰ صفحات کے اس مختصر سے پرچے میں آپ اتنا کچھ سمو دیتے ہیں کہ یہ سینکڑوں صفحات پر مشتمل مختلف دبستانوں کے ''نمائندہ'' جرائد پر بھاری نظر آتا ہے۔ حیرت اور خوشی ہمیں ڈاکٹر عباس برمانی کی کہانی پڑھ کر ہوئی۔ ڈاکٹر برمانی ہمارے دوست ہیں ان کے سفرناموں میں موجود کہانیاں تو ہماری نظر سے کئی بار گزریں مگر ان میں ایک کہانی کار بھی چھپا بیٹھا ہے اس کا ہمیں علم ہی نہیں تھا۔ اگر عباس برمانی نے کہانی کا سفر جاری رکھا تو جنوبی پنجاب کو ایک اچھا کہانی کار مل جائے گا ورنہ تو یہاں افسانہ نگاروں کا وہ قحط ہے کہ ڈاکٹر انوار احمد اور علی تنہا کے بعد کوئی اور نام دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اگرچہ احمد ندیم تونسوی، عمران اقبال اور احمد اعجاز بھلر بھی اچھے افسانے لکھ رہے ہیں مگر ان کا ابھی ابتدائی سفر ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ انوار احمد اور علی تنہا کی وجہ سے ملتان افسانے کے منظرنامے میں موجود ہے۔ علی تنہا کا ذکر آیا تو چلتے چلتے ایک دلچسپ واقعہ بھی سناتا جاؤں۔ شاہ جی نے ایک روز قمر رضا شہزاد کو بتایا کہ میں نے ابتدا میں شعر بھی کہے مگر میرے شعر سن کر رام ریاض نے کہا کہ علی تنہا تم شعر نہ کہا کرو بس افسانے ہی لکھو۔ قمر رضا شہزاد نے برجستہ جواب دیا کہ ''شاہ جی رام ریاض نے آپ کے افسانے نہیں سنے ہوں گے ناں۔'' اور چلتے چلتے یہ بھی بتا دوں کہ علی تنہا کے حوالے سے یہ واقعہ ہمیں قمر رضا شہزاد نے اس روز سنایا جب عباس برمانی نے ہمیں اپنی غزل سنانے کی کوشش کی تھی۔

(رضی الدین رضی۔ ملتان)

مرسلہ 'انگارے' کا ۳۹واں شمارہ صادر ہو چکا ہے۔ اِس کرم فرمائی پر شکریہ۔ ماشاءاللہ حسبِ

حالیہ شمارہ معیاری تخلیقات سے مزین تھا۔ ایک سے ایک بڑھی قسم کی تحریر ملاحظہ سے گزری۔ اب کی شمارے میں احمد فراز اور ظفر اقبال کی شمولیت سے انگارے کی تپک میں مزید اضافہ ہوا۔ کئی اچھے شعر مطالعے میں آئے۔ مضامین بھی خوب تھے۔ آپ کی 'چند باتیں' کسی مبسوط مقالے سے کم نہیں ہوئیں۔ 'حروفِ زر' کے حصے میں احباب کا رموزیں چھانٹنا اچھا لگا۔ آپ نے ظفر اقبال جیسے کثیر الجہتی افکار کے حامل شاعر کے اعترافِ فن میں 'ظفر اقبال طبر' نکالنے کا عندیہ دیا۔ آپ جانیں ظفر اقبال کے کل کلام میں تقریباً چاس عدد غزلیں ایسی ہیں کہ جن کا جواب پورے اُردو شعری ادب میں نہیں ملتا۔ انگارے کے سب اہلِ قلم کو ہمارا سلام ہے۔

(پرویز ساحر۔ ایبٹ آباد)

آپ کی محبتوں سے انگارے کا تازہ شمارہ یعنی چوتھے سال کی تیسری کتاب ملی۔ اِس کے لیے بہت شکر گزار ہوں۔ آپ کی شبانہ روز محنتوں سے انگارے دِن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ ''انگارے'' اب ایک عمدہ ادبی پرچوں کی فہرست میں نظر آتا ہے۔ میری طرف سے مبارک ہو۔ تازہ شمارہ میں ''آپ کی چند باتیں'' بہت فکر انگیز ہیں۔ واقعتاً عہد حاضر میں نظریاتی وابستگی پر قائم رہنے والے شعراء اور ادیب نظر نہیں آ رہے، یہ ایک المیہ ہے۔

مضامین میں ڈاکٹر محمد امین، روشن ندیم اور تنویر صاغر کے مضامین اچھے لگے۔ اِس تازہ شمارے کی خصوصیت ''گوشہ ظفر اقبال ہے''۔ ظفر اقبال عہد حاضر کے ایک عمدہ بڑے غزل گو ہیں۔ انگارے نے اُن پر گوشہ قائم کر کے انہیں خراج تحسین پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مزید خوشی اِس اعلان سے ہوئی کہ انگارے کا آئندہ شمارہ ظفر اقبال نمبر ہوگا۔ گوشہ ظفر اقبال میں ''پروفیسر مزمل حسین اور سیدہ سیفو کے مضامین تفہیم ظفر اقبال کی ایک کامیاب کوشش ہیں۔ ظفر اقبال کی ۲۶ غزلیں کمال ہیں۔ ظفر اقبال ایسا زود گو اور عمدہ شاعر ہندو پاک میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔

کہانیاں اور کتابوں پر تبصرے بھی اچھے ہیں۔ غزلیات میں، احمد فراز، احمد صغیر صدیقی، خاور اعجاز اور خیال امروہی نے متاثر کیا، نظموں میں اصغر علی شاہ، احمد صغیر صدیقی، ندیم ساحل اور روشن ندیم کی نظمیں اچھی لگیں۔

قارئین کے خطوط میں جناب احمد صغیر صدیقی کا خط پڑھ کر بہت دُکھ ہوا۔ اگر جناب غلام حسین ساجد نے اپنے مضمون میں اُن کا ذکر نہیں کیا تو صدیقی صاحب اس قدر نالاں ہوئے کہ انہوں نے بہت سے عمدہ لکھنے والوں کو (جن کا ذکر ساجد صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے) رگیدا ہے اور تو اور اُن کی زد میں ہمارے دوست جمشید ساحل بھی آ گئے۔ بے چارے ساحل صاحب بھول چوک کر ہماری تعریف کر بیٹھے تھے۔ صدیقی صاحب ایک اچھے شاعر ہیں، اُنہیں، رفیق سندیلوی، قمر رضا شہزاد وغیرہ کی شعری فتوحات کا

علم ہونا چاہیے۔ میں تو طفل مکتب ہوں اِس لیے اپنے بارے کچھ نہیں عرض کروں گا۔ احمد صغیر صدیقی کے بقول غلام حسین ساجد صاحب نے بہت سے اچھا لکھنے والوں کے کلام میں نقائص نکالے ہیں۔ صدیقی صاحب نے بھی عہد حاضر کے اچھا لکھنے والوں کو خوامخواہ خراب کیا ہے۔ اگر ساجد صاحب نے صدیقی صاحب کا ذکر اپنے مضمون میں نہیں کیا تو صدیقی صاحب نے اُن کی شعری حیثیت کو ماننے سے انکار کر دیا ہے جو عہد حاضر میں اچھا لکھ رہے ہیں۔

ہم غزل اور نظم کے ناقدین اور مضامین نگاروں سے درخواست گزار ہیں کہ آئندہ اپنے مضامین میں صدیقی صاحب کا ذکر ضرور کیا کریں ورنہ۔۔۔۔

رفیق سندیلوی اور قمر رضا شہزاد واقعتاً ہماری جدید تر اُردو غزل کے نمائندہ نام ہیں۔

غلام حسین ساجد صاحب بھی عہد حاضر کے ایک صاحب اسلوب شاعر ہیں اُن کی شاعری کے حوالے سے بھی صدیقی صاحب کے زیادتی کی ہے۔

(کاشف مجید۔ اوکاڑہ)

رسید و اطلاع:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی)، ڈاکٹر معین الدین عقیل (کراچی) ڈاکٹر علی ثنا بخاری (لاہور)، غلام حسین ساجد (لاہور)، افتخار عارف (اسلام آباد)، ناصر بخاری (اسلام آباد)، ظفر اقبال نادر (عارف والا)، حصیر نوری (کراچی)، فہیم شناس کاظمی (نواب شاہ سندھ)، ڈاکٹر روبینہ شاہجہاں (پشاور)، صابر عظیم آبادی (کراچی)، کاشف مجید (اوکاڑہ)، تنویر صاغر (لاہور)، ڈاکٹر افتخار بیگ (لیہ) ڈاکٹر علمدار بخاری (سرگودھا)، محمد امین الدین (کراچی)، نسیم عباس (ساہیوال)، جمن جنجنی (لاڑکانہ) عطا الرحمٰن قاضی (عارف والا)، اکرم عتیق (وہاڑی)، مشتاق شبنم (کراچی)، طاہر نقوی (کراچی)

☆☆☆